ماہنامہ

رفیقِ منزل

نئی نسل کا معمار اور تعمیر و ترقی کا داعی

جلد: ۳۰ | شمارہ: ۱۱ | نومبر ۲۰۱۷ء | صفر المظفر - ربیع الاول ۱۴۳۹ھ

editor@rafeeqemanzil.com

MANAGER
Bilal Khan 9029194433
managerrmgp@sio-india.org

Asst. MANAGER
Abdul Jabbar 08447622919
asst.managerrmgp@sio-india.org

₹15 | سالانہ ₹160

D-300, Abul Fazl Enclave Jamia Nagar, Okhla New Delhi - 110025 | Tel: 26949817 | Email:managerrmgp@sio-india.org | www.rafeeqemanzil.com

Printed on behalf of The Students Islamic O rganisation ofIndia, Printer & Publisher Tanveer Alam, Printed at Bharat Offset, 2034/35, Qasim Jan Street, Ballimaran, Delhi - 110006, Published from 230, Abul Fazl Enclave, Jamia Nagar, Okhla, New Delhi - 110025 | **Editor : Abul Aala Sayyed**

ڈاکٹر وقار انور

مل جائے لے لو، روکا جائے رک جاؤ

ما اوتیکم من شیئٍ و ما امنعکموہ ان انا الا خازن اضع ما امرت (راوی ابوہریرہؓ / السلسۃ الصحیحہ 2194)

''ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا: نہ میں تمہیں کوئی چیز دیتا ہوں، نہ کوئی چیز روکتا ہوں۔ میں تو (اللہ کی طرف سے مامور) خازن ہوں، جیسا حکم دیا جاتا ہے ویسا ہی کرتا ہوں۔''

اس حدیث میں آں حضرتؐ نے اپنے کام اور مقام کے بارے میں جو خبر دی ہے اس کا ذکر قرآن کریم میں حکم کے انداز میں موجود ہے۔

ما اتکم الرسول فخذوہ و ما نھکم عنہ فانتھوا (الحشر ۷) ''جو کچھ رسول دیں لے لو، اور جس سے روکیں رک جاؤ''

اس حدیث میں آں حضرتؐ نے اپنا مقام اور کام ''خازن'' بتایا ہے جب کہ ایک دوسری حدیث میں ''قاسم'' کا لفظ استعمال کیا ہے۔

انما انا قاسم و اللہ یعطی (متفق علیہ)۔ ''میں بانٹنے والا ہوں۔ اللہ دینے والا (عطا کرنے والا) ہے۔''

''خازن'' اور ''قاسم'' دونوں خوبصورت تعبیرات ہیں۔ خازن یا قاسم کا کام حکم کے مطابق دینا اور بانٹنا ہوتا ہے۔ اگر ان کی طرف سے ملے تو اس کا مطلب ہے کہ خزانہ کے اصلی مالک کی طرف سے ہی فیصلہ ہوا ہے۔ خازن، خزانہ کے حقیقی مالک کے اذن اور اس کی منظوری کے بغیر کچھ عطا نہیں کرتا ہے۔ اور اگر وہ کچھ دینے سے منع کر دیتا ہے تو یہ بھی اسی وجہ سے ہوتا ہے کہ مالک حقیقی کی مرضی یہی ہے۔ اس طرف عوام الناس اور مالک حقیقی کے درمیان رابطہ کی کڑی خازن اور قاسم کی بن جاتی ہے۔ مالک حقیقی کی مرضیات کا علم خازن اور قاسم کے ذریعہ حاصل ہو جاتا ہے۔

حقیقت حال کی یہ خبر جو حدیث مذکورہ سے ہم تک پہنچی اس کا مطلب یہ بھی ہوتا ہے کہ اس واسطہ سے جو عطا ہوتا ہے اس پر اگر دل میں تنگی ہو یا اس ذریعہ سے جو منع کر دیا جاتا ہے اس کا ملال ہو تو اس کا مطلب صرف یہ نہیں ہے کہ خازن کی ناقدری ہوئی بلکہ اس کا مطلب یہ بھی ہوتا ہے کہ خزانہ کے اصل مالک کا کفر کیا گیا اور اس کے حکم و مرضیات سے روگردانی کی گئی۔ دنیا اور آخرت کی تمام نعمتوں کا حقیقی مالک و آقا اللہ تبارک و تعالیٰ ہے اور انسانوں کے حق میں جو شئے بھی غیر مفید اور ضرر رساں ہے اس سے واقفیت مکمل طور پر رب کائنات کو حاصل ہے کیوں کہ جس شئے میں بھی شر ہے اس کا خالق وہی ہے اور اس کی اجازت کے بغیر کوئی پتہ بھی نہیں ہل سکتا ہے۔ اللہ تبارک و تعالیٰ نے اپنی نعمتوں سے واقف کرانے اور اپنی پیدا کی ہوئی اشیاء کے شر سے مطلع کرنے کی غرض سے زمین پر انبیاء کرام کا ایک سلسلہ جاری کیا جو حضرت محمد مصطفیؐ پر ختم ہوا۔

اس زمین پر جب تک انسانی آبادی آباد ہے اس کے افراد کے لیے اللہ کی مرضیات جاننے کے صرف دو ذرائع ہیں۔ ایک قرآن کریم اور دوسرا سنت رسول اللہؐ۔ اور انسانوں تک ان دونوں ذرائع آپؐ سے ہی پہنچے۔ قرآن کریم آپؐ کی زبان مبارک پر جاری ہوا اور سنت آپؐ کے ہی قول و عمل و سکوت کا نام ہے۔ اس طرح ہمیں جو کچھ ملا ہے وہ یا تو چند عقائد و اعمال میں جن کو اختیار کرنے کی تعلیم دی گئی یا دیگر عقائد و اعمال ہی جن کو اختیار نہ کرنے کی تعلیم دی گئی ہے۔ دوسرے لفظوں میں کچھ دیا گیا اور کچھ دینے سے روک دیا گیا۔ دراصل یہی پورے دین اسلام کا خلاصہ ہے۔

درج بالا حدیث میں آں حضرتؐ نے اپنے آپ کو خازن کہا ہے۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ آپؐ سے کچھ عطا ہونے اور کچھ چیزوں سے روک دیے جانے کہ حیثیت خزانہ کی ہے۔ ملنا بھی نعمت اور روک دیا جانا بھی خیر ہے۔

اس حدیث میں ایک اور پہلو پر روشنی پڑتی ہے۔ قرآن کریم کی متعدد آیات میں یہ بات کہی گئی ہے اور مختلف احادیث میں اس کا ذکر موجود ہے کہ انبیاء کرام انسانوں سے اپنے کام کا کوئی اجر نہیں چاہتے ہیں۔ حضرات انبیاء کرام کا اجر اللہ تعالیٰ کے پاس محفوظ ہے اور ان کی کوئی ذاتی غرض دیگر انسانوں سے وابستہ نہیں ہوتی ہے۔ خازن کو خزانہ کے مالک نے بحال کیا ہوتا ہے۔ مالک کی ہی طرف سے اس بحالی کے شرائط اور حدود اور ذمہ داری ادا کرنے کی صورت میں اجر کا تعین ہوتا ہے۔ جو لوگ خزانہ سے خازن کے ذریعہ فائدہ اٹھاتے ہیں ان سے خازن بے نیاز ہوتا ہے۔ ہمارے آقا و سردار سیدنا محمد الرسول اللہؐ نے اپنی تمام توانائی انسانوں تک انسانوں کے خیر کے پیش نظر جو مشقتیں جس صبر و استقلال کے ساتھ اٹھائیں اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ وہ اس پر مامور کیے گئے تھے اور اس کام کو جس احسن طریقہ سے انجام دیا اس کے اجر کے طور پر مقام محمود پر فائز کر دیے گئے۔ تسلیماً کثیراً کثیرا

اندھی رائیں

گاؤں کی مسجد کا استعمال نماز پڑھنے کے علاوہ اور بھی کئی کاموں کے لئے ہوتا تھا۔ مولوی صاحب اردو اور عربی کی تعلیم دیا کرتے تھے۔ عصر کے بعد فضائل اعمال کا مطالعہ کیا جاتا اور شرک و بدعات سے دور رہنے کی تلقین کی جاتی۔ ان کاموں میں خدمت خلق کے بھی کئی کام شامل تھے۔ مثلاً گاؤں کا سب سے اچھا اور صاف ستھرا بیت الخلاء یہیں موجود تھا۔ اکثر مسلمان اور مسجد کے پڑوسی غیر مسلم اس بیت الخلاء کا استعمال کرتے تھے۔ گاؤں کے لوگوں نے مسجد میں پانی کا معقول انتظام کر رکھا تھا۔ گاؤں میں پانی کی جب بھی قلّت ہوتی تو سارا گاؤں مسجد ہی کا رخ کرتا۔ ایک پڑھا لکھا ہندو نوجوان اپنے دوست احباب کے ساتھ گاؤں کی زندگی کا مزہ لینے وہاں آیا ہوا تھا۔ ایک دوست اسے پانی پلانے کی غرض سے مسجد لے آیا۔ مولوی صاحب نے بھاری بھرکم توند سے آواز نکال کر کہا 'السلام علیکم'۔ علیکم کی عین کا تلفظ حلق کی کسی کھائی سے ہوا تھا۔ مونچھیں بالکل نہیں تھیں۔ داڑھی یک مشت تھی۔ کلی کا کرتا پہنے ہوئے تھے۔ پاجامہ بہت اونچا باندھا تھا۔ ماتھے اور ٹخنے پر نماز کے گٹھے پڑے تھے۔ نوجوان نے نخوت بھرے انداز سے انہیں دیکھا اور اپنے دوست سے مخاطب ہو کر انگریزی میں بولا 'یہاں سے جلدی نکلو، ورنہ یہ مُلّا ہم پر بے دین ہونے کا فتویٰ لگا دے گا'۔ حلق کی اسی کھائی سے ایک مستحکم آواز ابھری 'It would still be just an opinion, you know!'۔ کچھ دیر تو سناٹا چھا گیا۔ پھر کسی ذہن میں چھناکے کے ساتھ ایک بت ٹوٹ گیا۔

چھوٹی سے عمر کا وہ لڑکا بڑا عجیب سا لگ رہا تھا۔ کلاس میں الٹرا ماڈرن اور سیڈ و سیکولر طلباء و طالبات کے درمیان وہ دھوتی اور بھگوا کرتے میں سب سے مختلف اور غیر متعلق تھا۔ سماجیات کے اس لیکچر میں مذاہب پر بات ہونے لگی۔ ایک لڑکی جس نے بالشت بھر کا اسکرٹ پہنا تھا، بالوں کو ڈائی کر کے اس میں بیڈس پُروا کر، مٹک رہی تھی فوراً کھڑی ہوئی۔ اس نے ٹوٹی ہوئی انگریزی میں کہا کہ آئندہ آنے والے کچھ سالوں میں انڈیا میں صرف مسلمان ہی مسلمان ہوں گے۔ اس لئے کہ وہ فیملی پلاننگ نہیں کرتے اور خرگوش کی طرح بچے پیدا کرتے چلے جاتے ہیں۔ مسلمانوں کی اس روش سے ہندوستان کے دیگر مذاہب کو زبردست خطرہ لاحق ہو گیا ہے۔ سماجیات کی وہ استانی، افسردہ لہجے میں مسلمانوں کی اس روش اور ہندو دھرم کو لاحق خطروں کے بارے میں تفصیل فراہم کرنے لگی۔ کمزور سی آواز اس جانب سے آئی جہاں وہ پنڈت نما نوجوان بیٹھا تھا۔ پوری کلاس کی توجہ اس پر مرکوز ہو گئی۔ اکثر بچے امید کرنے لگے کہ اب مزید شعلہ بیانی پر مشتمل اور جذبات کے طوفان میں بہتی ہوئی ایک تقریر سماعت کرنے کا موقع ملے گا۔ اور ہندو دھرم کے تحفظ کا حقیقی پروگرام پیش ہوگا۔ نوجوان کھڑا ہوا۔ اس نے اپنے کانوں کو ہاتھ لگایا۔ کانوں کے اوپر پھنسی ہوئی تلسی کو درست کیا اور شستہ انگریزی میں کہنے لگا، 'میم، ہندو دھرم کو کسی مسلمان سے کوئی خطرہ نہیں ہے۔ یہ مذہب محبت اور سماج کلیان پر مبنی مذہب ہے۔ اگر اس دھرم کو کوئی خطرہ ہے تب بھی کوئی پریشانی کی بات نہیں ہے کیونکہ بھگوان کرشن خود کہتے ہیں کہ यदा यदा हि धर्मस्य ग्लानिर्भवति भारत । अभ्युत्थानमधर्मस्य तदात्मानं सृजाम्यहम् ॥. اس لئے ہمیں اس بات کی فکر کرنی چاہئے کہ ہمارے کرم ہمارے دھرم کے مطابق ہیں یا نہیں'۔ بہت سارے بت ٹوٹ گئے۔ ان چھناکوں سے شعور کا کلاس روم گونج اٹھا۔

وہ ایک زبردست مقرر تھا۔ تنظیم میں اس کا ایک خاص مقام تھا۔ خاص بات یہ تھی کہ وہ تقریروں میں دلائل اور منطق کا ایسا جوڑ پیدا کرتا تھا کہ مخاطب کی عقل گھٹنے ٹیکنے پر مجبور ہو جاتی تھی۔ اس نے کہا کہ 'جہیز ایک لعنت ہے۔ شریعت کے نکتوں میں نہ پڑتے ہوئے اگر صرف عقل کا استعمال کریں تو بھی اس نتیجہ پر ہر سمجھ دار انسان پہنچ ہی جاتا ہے۔ سماج کے اس ناسور کا مقابلہ کرنے کے لئے علی الاعلان سادہ، آسان، کم خرچ اور جلد شادیوں کی روایت کو فروغ دینا ضروری ہے۔ اسی سے کوئی سماجی نشاط الثانیہ کا آغاز ہو سکتا ہے۔ ورنہ مادیت اور مادی خوبصورتی کے دلدادہ نوجوانوں سے کوئی دین اور کوئی اسلامی معاشرہ قائم نہیں ہو سکتا۔ جہاں جہیز مردانگی پر حرف ہے وہیں شادیوں میں بے جا خرچ اقامت دین کے منہ پر ایک تمانچہ'۔ مجلس میں ایک نوجوان اپنے خون میں وہ گرمی محسوس کر رہا تھا۔ اس نے سوچا کہ ابھی گھر جا کر اپنی والدہ سے اس بابت گفتگو کرے گا۔ لیکن اس سے قبل وہ اپنے محسن کے ہاتھوں کو چومنا چاہتا تھا۔ وہ یہ بتانا چاہتا تھا کہ یہ تقریر اس کی زندگی کا ایک سنگ میل ثابت ہوگی۔ اور وہ جب تک زندہ رہے گا اس کے دل میں ایک شخص کا راج رہے گا۔ وہ لوگوں کے درمیان سے ہوتا ہوا آڈیٹوریم کے کنارے پر پہنچ گیا۔ اس کا محسن نوٹس بورڈ پر زرق برق کاغذ پر مشتمل ایک رقعہ چسپاں کر رہا تھا۔ تمام اہل مجلس کو دعوت ولیمہ دی گئی تھی۔ ولیمہ شہر کی سب سے مہنگی جگہ منعقد تھا۔ وہ پلٹا تو اس کا محسن اہل مجلس سے مسکرا مسکرا کر شادی کے پیشگی مبارکباد قبول کر رہا تھا۔ ساتھ ہی انتظامات ولیمہ کا گاہے بگاہے تذکرہ بھی تھا۔ ایک تقریر نے گو اس کو درست راہ عمل دکھلائی تھی، لیکن اس کے دل کی دنیا کا ایک اہم بت مسمار ہو گیا تھا۔

انسان کو علم حاصل کرنے کی صلاحیت اللہ رب العزت نے بخشی ہے۔ اس صلاحیت کا استعمال بالخصوص انسانوں کو سمجھنے اور ان کے بارے میں رائے قائم کرنے کے لئے ہونا چاہئے۔ اس لئے کے انسانوں کے بارے میں جو ہماری رائے ہوتی ہے اسی کے مطابق ہمارا رویہ بھی ہوتا ہے۔ اور رویہ کا براہ راست تعلق انسان کی آخرت سے ہے۔ اس کے برعکس ہمارے لئے یہ بات آسان ہوتی ہے کہ ہم بہت ساری ظاہری اور سطحی بنیادوں پر لوگوں کے بارے میں رائیں قائم کر لیں۔ لیکن چونکہ ان میں علم کی روشنی نہیں ہوتی، اس لئے یہ اندھی ہوتی ہیں۔ ہمارے تعصّبات ہمارے اندھیرے ہیں، ان اندھیروں میں خدا کا نور حاصل کرنے کے لئے خلق خدا کے بارے میں اچھی رائیں قائم کرنا ایک لازمی امر ہے۔ اس شمارے میں تعصّبات کا تجزیہ کیا گیا ہے۔ پڑھ کر ہمیں بتائیں کہ کیا ان مضامین نے آپ کے ذہن کی گتھیوں کو سلجھایا؟ کیا اب آپ اپنے تعصّبات سے واقف ہو گئے ہیں؟ کیا آپ درست رائیں قائم کرنے کی صحیح بنیادیں جانتے ہیں؟

نجیب کی ماں!

نجیب کہاں ہے؟ اس سوال کا جواب نجیب کی ماں گزشتہ ایک سال سے تلاش کر رہی ہے، سال گزر گیا لیکن ان کے سوال کا نہ تو جواب ملا اور نہ ہی ان کے حالات میں کوئی تبدیلی آئی۔ یک سال کا عرصہ گزر چکا، نہ ہی داؤد ابراہیم کا پتہ لگانے والے خفیہ ادارے کامیاب رہے اور نہ ہی'' ہنی پریت'' کے پاس پولیس سے قبل پہنچ کر انٹرویو لینے والے میڈیا چینلز کچھ کام آئے۔ نجیب احمد کا کیس سب سے پہلے دہلی پولیس کے پاس تھا اور دہلی پولیس نے تحقیقات کے نام پر یونیورسٹی میں تلاش کرنے اور ملزمین سے پوچھ تاچھ کے بجائے درگاہوں اور مساجد میں نجیب کو تلاش کیا۔ تقریباً 7 ماہ بعد بھی کوئی اطلاع نہ ملنے اور دہلی پولیس کی ناقص کارکردگی پر سوال اُٹھاتے ہوئے دہلی ہائی کورٹ نے اس معاملہ کی تحقیقات کی ذمہ داری سی بی آئی کے حوالہ کردی۔ گزشتہ ایک سال میں پولیس، کرائم برانچ، خفیہ ایجنسی اور ہندوستان کی سب سے بڑی جانچ ایجنسی سی بی آئی بھی نجیب کی تلاش میں پوری طرح'' ناکارہ'' ثابت ہوئی۔ رپورٹس کے مطابق پولیس کی لاپرواہی کا عالم یہ ہے کہ نام نہاد حملہ آوروں کے ساتھ اس نے حراستی پوچھ تاچھ بھی نہیں کیا ہے، دوسری لاپرواہی یہ ہے کہ نجیب کیس کی جانچ کر رہی سی بی آئی تازہ ایف آئی آر درج کرنے کے بجائے پرانے ایف آئی آر کو ہی پھر سے درج کیا ہے اس کے علاوہ سی بی آئی بھی عدالت سے تحقیقات کے لئے مزید وقت کی مانگ کر رہی ہے۔

نجیب کو غائب ہوئے پورا ایک سال ہو چکا ہے۔ اس ایک سال کے دوران نجیب کی ماں نے کئی مظاہرے کیے، پولیس کی لاٹھیاں کھائیں اور میڈیا کو کئی انٹرویو بھی دیئے۔ بی بی سی کے ایک انٹرویو میں فاطمہ نفیس کا کہنا تھا کہ سی بی آئی نے پچھلے چھ ماہ کے دوران جو کیا وہ میری سمجھ سے باہر ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ تحقیقات کی ذمہ داری سی بی آئی کو عدالت نے دی ہے اور انہیں عدالت کو جواب دینا پڑے گا۔'' مجھے امید ہے کہ اس مظاہرے کا اثر ہوگا اور اگلی سماعت میں سی بی آئی عدالت کے سامنے کوئی ٹھوس ثبوت پیش کرے گی۔ نجیب کے بغیر ایک سال کیسے گذرا؟ اس بارے میں ان کی ماں کہتی ہیں'' میرے پاس یہ بیان کرنے کے لیے الفاظ نہیں ہیں۔ ان کا کہنا تھا کہ اس سال کے دوران میں نے ایک ایک لمحہ درد محسوس کیا ہے''۔ تمام مشکلات کے بعد بھی فاطمہ نفیس نے اپنے بیٹے کے ملنے کی امید نہیں چھوڑی۔ ان کا کہنا تھا'' میں ایک امید کے ساتھ جی رہی ہوں اور یہ امید ہی میرا حوصلہ بڑھاتی ہے، میں اس پل کا انتظار کر رہی ہوں جب ہزاروں لوگوں کی امیدوں کا اثر ہوگا اور میرا بیٹا نجیب واپس لوٹے گا۔'' بی بی سی کو دئے گئے اس انٹرویو کے الفاظ اس ماں کے درد کو بیاں کرتے ہیں، ایک ماں اپنے گمشدہ بیٹے کے لیے کیا کیا کر سکتی ہے فاطمہ اس کی ایک مثال ہیں۔ انٹرویو میں وہ مزید کہتی ہیں' میں نے زندگی کے وہ رنگ دیکھ لیے ہیں جن کے بارے میں کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ یہ سال بہت تکلیف دہ رہا ہے جو خون کے رشتے تھے اب وہ دور ہو گئے اور جن سے انسانیت کا رشتہ تھا وہ قریب آ گئے ہیں۔ اب میرے رشتے انہیں میں سے ہیں جو ایک سال سے میرے ساتھ کھڑے ہیں۔ جو لوگ میرے ساتھ ہیں وہ اس بات کی علامت ہیں کہ ابھی انسانیت زندہ ہے۔ آخر میں وہ کہتی ہے کہ'' میرا نجیب جہاں ہے اللہ کی پناہ میں ہے اور اللہ بہتر جانتا ہے۔ وہ جب گھر سے نکلا تھا میں نے اسے اللہ کی حفاظت میں دیا تھا اب وہ جہاں بھی ہوگا محفوظ ہوگا''، لیکن ان کی آنکھوں کی چمک اچانک آنسوؤں میں تبدیل ہوگئی۔ ہمت کی مورت یہ ماں ٹوٹتی نظر آنے لگی اور لڑکھڑاتی آواز میں کہنے لگی میں بہت تھک گئی ہوں، بہت زیادہ تھک گئی ہوں اب مجھ سے چلا نہیں جاتا، بہت مجبور ہوں۔ میں ہوں تو اتنے لوگ یہاں ہیں اگر میں نہیں آؤنگی تو میرے بیٹے کے لیے کوئی نہیں آئے گا۔

سب کا ساتھ، کارپوریٹس کا وکاس

نریندر مودی نے مئی ۲۰۱۴ میں جب اکثریتی حکومت این ڈی اے کی کمان سنبھالی تو بہت سے بلند و بانگ دعوے اور وعدے کئے۔ جس کی وجہ سے عوام کی امیدیں حکومت سے وابستہ ہوگئیں۔ ایسے لگتا ہے اب عوام کی وہ امیدیں ٹوٹنے لگی ہیں۔ ۴۰ مہینوں کے اس دور حکومت کا جائزہ لیا جائے تو محسوس ہوتا ہے کہ وہ وعدے اور دعوے صرف خام خیالی تھے۔ وزیر اعظم کے ذریعہ ایک ۵ رکنی معاشی مشاورتی مجلس (Economic Advisory Council) کا قیام کیا گیا۔ اس نے قیام ہوتے ہی اس بات کا اظہار کیا ہے کہ حکومت کی معاشی صورت حال ڈگمگائی ہوئی ہے۔ مودی حکومت کے اقتدار سنبھالنے کے بعد ہی بین الاقوامی بازار میں خام تیل کی قیمتوں میں خاطر خواہ کمی واقع ہوئی۔ لیکن اس کمی کے باوجود حکومت ہند نے پیٹرول کی قیمتوں میں کوئی کمی نہیں کی۔ بلکہ وقتاً فوقتاً پیٹرول کی قیمتیں بڑھتی رہی۔ دوسری جانب پچھلے کچھ سالوں میں اچھے مانسون کی وجہ سے زرعی پیداوار میں اضافہ درج کیا گیا۔ اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ صارفی قیمتوں کا اشاریہ CPI میں کمی واقع ہوئی۔ زرعی پیداوار میں اجافہ کی مناسبت سے اشیاء کی قیمتوں میں کمی مطلوب تھی۔ لیکن اس کے برعکس اشیاء خوردنی کی قیمتوں میں اچھال دیکھنے کو ملا۔ GDP یعنی مجموعی گھریلو پیداوار میں 7.5% سے 5.7% تک گذشتہ دو سالوں میں کمی واقع ہوئی ہے۔ اسی طرح صنعتی پیداوار ملک کی ترقی میں اہم رول ادا کرتی ہے۔ اس کا اندازہ ہم صنعتی پیداواری اشاریہ IIP کے ذریعے لگاتے ہیں 2014-15 میں 51% تھی جو 2015-16 میں 33% پر آ گئی۔ 2016-17 میں اس میں معمولی اضافہ دیکھنے کو ملا۔ مودی جی نے ملکوں ملکوں جا کر سرمایہ داروں کا ہندوستان میں سرمایہ کاری کرنے کی دعوت تو دی مگر ان دعوتوں کے نتیجہ میں ملک میں سرمایہ کاری میں کوئی اضافہ نہیں ہوا۔ بے روزگاری ہمارے ملک کا سب سے بڑا مسئلہ بن گیا ہے۔ 2004 سے 2012 کے درمیان روزگار کی شرح 1% تھی۔ جبکہ 2012 کے بعد سے اس شرح میں قابل لحاظ کمی واقع ہوئی ہے۔ نوٹ بندی اور جی ایس ٹی جیسے فیصلوں کی وجہ سے ملک کی معاشی حالت خطرناک حد تک متاثر ہوئی ہے۔ جس کا اظہار حال ہی میں ملک کے تین سابق وزرائے مالیات کر چکے ہیں۔

اس کے برعکس کارپوریٹ سیکٹر بہت خوش ہے۔ یکے از بعد دیگرے ان کے لئے سہولیات اور آسانیاں فراہم کی جارہی ہیں۔ لگژری ٹیکسیس کو کم کر دیا گیا ہے۔ سرمایہ کاری کرنے کے لئے لال فیتہ شاہی کم کرنے کے نام پر بے محابانہ آزادیاں فراہم کی جارہی ہیں۔ جو ماحولیاتی اور سماجی بحران بڑے سرمایہ کاروں کی وجہ سے پیدا ہونے کا امکان ہے اس کو نظرانداز کر کے ان کو مختلف قسم کی مراعات فراہم کی جارہی ہیں۔ عوام اپنے مسائل میں الجھی ہوئی ہے اور اسے الجھائے رکھنے کا مکمل انتظام کیا جارہا ہے لیکن کارپوٹس کو ہر ممکن ذریعے سے فروغ دیا جارہا ہے۔ دولت اور طاقت کا کھیل دیکھنا ہے کب تک جاری رہتا ہے۔

رفیق کی رفاقت

رفیق کا اکتوبر کا شمارہ سامنے موبائل اسکرین پر ہے، ارادہ تھا کہ ایک سرسری نظر ڈال کر اپنے کاموں میں پھر مصروف ہو جاؤں گا، مگر تقریباً ایک گھنٹے تک مسلسل مطالعہ میں کھویا رہا۔ بات دراصل یہ ہے کہ مضامین کو بڑے حسن انتخاب سے شامل کیا گیا ہے۔ موجودہ سیاسی ابال کے تحت شبیع الزماں کی سیریز کی حالیہ تحریر بہت کچھ سمجھا جاتی ہے۔ پروفیسر محسن عثمانی کی تحریر بڑی اچھی تھی مگر موصوف نے غلطی نمبر ۲ میں جو بیان کیا وہ ہمیں سمجھ نہیں آیا کہ کیونکر اسے غلطی مانیں، بابری مسجد کی آراضی کا اگر وہ بٹوارہ ہو بھی جاتا تو ظاہری طور پر سب کچھ ٹھیک لگتا مگر آئے دن جھگڑا فساد کے علاوہ وہاں اور کچھ نہیں ہونا تھا، اسی ضمن میں کچھ سال قبل کورٹ کے فیصلے پر انتظار نعیم صاحب کی نظم گھر خدا کا تین حصوں میں کہیں بٹتا ہے کیا، بڑی خوبصورت نظم تھی۔

بٹ کوئن پر ادھر کچھ دنوں سے کافی بحث جاری ہے احمد مذکر کا مضمون اس ضمن میں کافی معلوماتی ہے۔ باقی مضامین سبھی خوب ہیں۔

اہم تعلیمی اداروں کے تعارف کا جو سلسلہ رفیق منزل میں شروع ہوا ہے اس کی اہمیت و افادیت، امت کے حالات کے پیش نظر کچھ بھی نہاں نہیں۔ اس رفیق کی رفاقت میں بہت کچھ سیکھنے سمجھنے کو مل رہا ہے، آپ لوگوں کی محنت کو سلام اور اسکے پیچھے جو تحریک ہے اسے سلام۔۔۔!

شارق شیبی، ریاض

کونوا قوّامین بالقسط؟

مونچھیں رکھنے پر راجپوتوں لے ذریعے دلت نوجوانوں کی پٹائی، نوراتری کا ناچ (گربھا) دیکھنے پر دلت نوجوان کا قتل، گذشتہ دنوں کی یہ خبریں نام نہاد ترقی یافتہ گجرات کی تصویر پیش کرتی ہیں۔ وہیں ماضی قریب میں کرناٹک میں کنویں کا پانی کے استعمال سے روکنے کے لئے نقصان دہ مائع کنویں میں ڈالنے کا واقعہ، پسماندہ طبقات کی عورتوں کو علاج کے بہانے سے بانجھ کر دینا، پنجاب میں دلت نوجوان کی معمولی سے چوری کے نتیجہ میں اس پر درندوں جیسا تشدد، وغیرہ جیسے سینکڑوں دلدوز واقعات اس ملک میں ہر روز ہو رہے ہیں۔ گذشتہ دنوں مدھیہ پردیش میں جب ایک دلت شخص نے توہین آمیز کلمات کی بنیاد پر کچھ لوگوں کے خلاف شکایت درج کرائی تو ان ظالموں نے اس شخص کو پیٹ پیٹ کر مار ڈالا، اور اس کے خاندان پر بھی مظالم کئے۔ گئو رکشکوں کے ذریعے مسلمانوں کے ساتھ ساتھ دلتوں پر بھی حملے خبروں کا حصہ بنے رہے ہیں۔ بظاہر سیکولر امیج والے سیاستداں بھی ایسے واقعات کے حوالے سے محض سیاسی روٹیاں سینکتے رہتے ہیں۔ قانونی اعتبار سے حالانکہ پسماندہ طبقات پر مظالم کے خلاف خصوصی قانون بھی موجود ہے، مگر اس پر نفاذ کا تناسب انتہائی کم ہے، بلکہ ایک رپورٹ کے مطابق تو ریاست تمل ناڈ میں اس قانون کے تحت 94 فیصد مجرمین چھوٹ جاتے ہیں۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ صرف لا اینڈ آرڈر کا مسئلہ نہیں، بلکہ اس کی جڑیں ہندوستان کے قدیم سماجی ڈھانچے میں پیوست ہیں۔ سماجی تفریق کے حل کے طور پر آئین میں ریزرویشن کو جگہ دی گئی ہے مگر اب اس بنیاد پر مزید نفرتوں کو ہوا دی جا رہی ہے۔ خود مسلمان اس ملک میں جا بجا مسائل سے دو چار تو ہیں، اور اس کے خلاف آواز بھی بلند کر رہے ہیں، مگر اس بات کو سمجھنے کی ضرورت ہے کہ ملت اسلامیہ محض اپنے لئے نہیں بلکہ انسانیت کی بھلائی کے لئے برپا کی گئی ہے، لہٰذا پسماندہ طبقات کے خلاف سماجی نفرت اور مظالم سے نمٹنے کے لئے مسلمانوں کی جانب سے نمایاں اور عملی کوششوں کی ضرورت ہے۔ خیر امت کے خطاب کے ساتھ ہی اللہ رب العزت نے مسلمانوں کو عدل و انصاف کا علمبردار بننے کا حکم دیا، کونوا قوامین بالقسط۔ اس کی روشنی میں مسلمانوں کو اپنا احتساب کرنے کی ضرورت ہے اور مسلمانوں کی مذہبی اجتماعیتوں کو بھی اپنے گریبان میں جھانکنا چاہئے کہ کہیں وہ بھی محض اقتدار پسند سیاستدانوں کی طرح اپنی مذہبی چودھراہٹ کی خاطر خدا کے اس حکم سے صرف نظر تو نہیں کر رہے۔ خدا کا وعدہ ہے کہ بے شک احسان کا بدلہ سوائے احسان کے اور کیا ہو سکتا ہے۔

ابورجاء، دہلی

عبدالملک شارق

تعصب کا آسیب

ہمارے ملک کے وزیراعظم نے یوم آزادی کی تقریر کے موقع پر ''نیوانڈیا'' کا نعرہ لگایا، جسمیں انہوں نے GST کے نام پر ٹیکس اصلاحات اور کالے دھن کے نام پر نوٹ بندی Demonetisation جیسے کارناموں کا ذکر کیا، یہ سب انہیں تاریخ میں منفرد مقام دلا چکے ہیں، ان کی حیثیت ''عصر حاضر کے تغلق'' کی ہوگی یا کچھ اور، یہ تو وقت ہی بتائے گا لیکن سماجی سطح پر نئے ہندوستان میں بڑھتے ہوئے تعصب، عدم تحمل، عدم رواداری، عدم برداشت، فرقہ پرستی، کٹر پن، جنگجو وطن پرستی، میڈیا کی زبان بندی و میڈیا کی جانبداری، بھیڑ کے ذریعہ قتل، گاؤ رکھشا کے نام پر دہشت گردی کے واقعات کی کثرت اور ان پر وزیراعظم کا ''منموہن کی خاموشی'' والا رویہ اختیار کرنے کی بنا پر انہیں ضرور یاد رکھا جائے گا۔ Pew Research کی رپورٹ کے مطابق مذہبی عدم رواداری کی رینکنگ والے ۱۹۸ ممالک کی فہرست میں شام، نائجیریا اور عراق کے بعد ہندوستان چوتھے نمبر پر کھڑا ہے۔ نیشنل کرائم ریکارڈ بیوریو کے اعداد وشمار کے مطابق ہندوستان میں یوں تو فسادات میں ۲۰۱۰ سے ۲۰۱۵ کے درمیان کمی واقع ہوئی ہے لیکن یوپی اور بہار کی ریاستوں میں فسادات دو ہندسی گنا رفتار سے بڑھ گئے ہیں۔ یو ایس کمیشن برائے عالمی مذہبی آزادی کی ۲۰۱۶ کی رپورٹ کے مطابق ہندوستان میں مذہبی روادری کی کیفیت خستہ اور مذہبی آزادی میں خلل میں اضافہ ہوا ہے۔ یواین کی رپورٹ برائے ذات پات پر مبنی امتیازات ۲۰۱۶ کے مطابق کمزور اور پچھڑے ہوئے طبقات آج بھی ہندوستان میں کسمپرسی کی حالت میں ہے۔ سماج میں بڑھتا ہوا تعصب کا آسیب، ''کثرت میں وحدت'' والے پلورل سماج (تکثیری) کو پولارائزڈ سماج (قطبی) بنا رہا ہے۔ اور اقبال کے یہ اشعار آج کے حالات پر بھی صادق آتے ہیں۔

رلاتا ہے ترا نظارہ اے ہندوستان! مجھ کو
کہ عبرت خیز ہے تیرا فسانہ سب فسانوں میں
وطن کی فکر کر ناداں مصیبت آنے والی ہے
تری بربادیوں کے مشورے ہے آسمانوں میں
نہ سمجھوگے تو مٹ جاؤ گے اے ہندوستان والو!
تمھاری داستان تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں
تعصب چھوڑ ناداں! دہر کے آئینہ خانے میں
یہ تصویریں ہیں تیری جن کو سمجھا ہے برا تو نے

(تصویر درد۔ بانگ درا۔ ۱۹۰۴)

اس مضمون میں عصبیت وتعصب کا تجزیہ کرنا مقصود ہے۔ ان الفاظ کا عربی زبان میں مصدر 'ع'۔ 'ص' اور 'ب' ہے۔ اور ان سے بننے والے الفاظ کے معنیٰ ''پٹی'' کے ہیں جو زخم پر یا آنکھوں پر باندھی جائے اسکے علاوہ ان کو 'بدن کے پٹھے جو جوڑوں کو تھامے ہوئے ہیں' یا

''وہ جماعت جس کے افراد ایک دوسرے کے حامی و مددگار ہوں'' کے معنوں میں بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ انگریزی زبان میں لفظ تعصب کو Narrow Mindedness تنگ نظری سے تعبیر کیا جاتا ہے جبکہ لفظ عصبیت کو partisanship, Bigotry,Prejudice اور tribalism سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ آج کل دونوں الفاظ کو مترادف کے طور پر بھی استعمال کیا جارہا ہے۔

تحقیق کے مطابق عصبیت ہمیشہ مذموم و مردود نہیں ہوتی اور تعصّب کو کبھی بھی محمود و مقبول کے درجے پر نہیں رکھا گیا۔ ابن خلدون نے جب عصبیت کی ضرورت بتائی تو اس کے محمود و مقبول ہونے کی وجہ سے بتائی ہے۔ قرابت داروں سے محبت، دوستوں سے تعلق، برادری سے وابستگی، مظلوم کی حمایت، حق دار کی مدد، طاقتور کے مقابلے میں کمزور کے ساتھ کھڑا ہونا، عدل کے اصولوں کی نگہداری کرنا عصبیت کے دائرے کے عمل ہیں اور اس وقت تک یہ محمود ہیں جب تک عصبیت تعصّب میں نہ بدل جائے۔ عصبیت مثبت انداز میں بروئے عمل آئے تو ملی، قومی، قبائلی، خاندانی، ذاتی روایات و اقدار کے 'خزانے' کو سینے سے لگائے رکھنے کا داعیہ پیدا کرتی ہے۔ اس کے برعکس تعصّب حسد، نفرت و حقارت اور انتقام پر ابھارتا ہے اور سماجی رشتوں کو کاٹتا اور کمزور کرتا ہے۔ عصبیت ایک اندرونی کیفیت ہے۔ کسی فرد یا گروہ، قوم، قبیلے یہاں تک کہ معتقدات، اصول و مبادی، نظریات و افکار کے دفاع کا داخلی نظم ہے لیکن تعصّب کا رخ ہمیشہ اندر سے باہر یعنی دوسروں کی طرف ہوتا ہے۔ اس سے ہٹ کر بعض کے نزدیک عصبیت پہلے پہل مثبت جذبہ کے طور پر مستعمل تھی بعد میں اسکا اطلاق منفی جذبہ پر بھی ہونے لگا لیکن تعصب یقینی طور پر صرف منفی جذبہ ہی کے لئے مستعمل رہی ہے۔ علامہ اقبال کے مطابق

شجر ہے فرقہ آرائی، تعصب ہے ثمر اس کا
یہ وہ پھل ہے کہ جنت سے نکلواتا ہے آدم کو

یہ انسان سے شیطان کا حسد و تعصب ہی تھا جسکی بنا پر شیطان نے حضرت آدمؑ کو ممنوعہ پھل کھانے کی ترغیب دی اور یہی تعصب تھا جس کی وجہ سے زمین پر ہابیل و قابیل کے درمیان لڑائی، قتل کا موجب بنی۔ اسلام کی نظر میں عصبیت اور تعصب کا کیا مقام ہے اس کو واضح کرنے میں سنن ابن ماجہ کی حدیث سے مدد ملتی ہے حدیث میں ہے کہ ایک صحابی نے اللہ کے رسولؐ سے پوچھا: اے اللہ کے رسول! کیا اپنی قوم سے محبت رکھنا تعصب ہے؟ آپؐ نے فرمایا: نہیں بلکہ ظلم پر قوم کی مدد کرنا تعصب ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ عصبیت اپنی فطری حیثیت میں مطلوب ہے جبکہ تعصب غیر مطلوب۔ ابن خلدون نے مقدمہ تاریخ میں عصبیت پر یہ تبصرہ کیا ہے۔

''حکومت عصبیت کی ایک طبعی غرض و غایت ہے جس کے واقع ہونے میں اختیار کو ذرا سا بھی دخل نہیں بلکہ عصبیت حکومت کا تقاضا ہے اور اسی سے حکومت وجود میں آتی ہے۔ شریعتوں کو مذہبی تحریکات کو بلکہ ہر قسم کی تحریکات کو (جسے جمہور لے کر اٹھتے ہیں) عصبیت کے بغیر چارہ نہیں۔ کیونکہ عصبیت ہی سے حقوق منوائے جاتے ہیں اور تکمیلی مراحل تک پہونچتے ہیں لہذا مذہب کے لئے عصبیت ہونا ضروری ہے اور عصبیت ہی کے بل پر اللہ کے احکام جو مذہب کی شکل میں پیغمبر لے کر آتے ہیں، پروان چڑھتے ہیں اور پھلتے پھولتے ہیں چنانچہ ایک صحیح حدیث میں ہے کہ اللہ نے ہر نبی کو اس کی قومی طاقت ہی میں بھیجا ہے، پھر ہم شریعت کو عصبیت کی برائی کرتے ہوئے پاتے ہیں اور اس عصبیت کو نظر انداز کرنے کی ہدایت کی ہے چنانچہ رحمت عالمؐ نے ارشاد فرمایا اللہ تعالیٰ نے تم سے عہد حاضرہ پر غرور کو اور نسبت پر فخر کو مٹا دیا ہے تم سب آدم کی اولاد ہو اور آدم کو مٹی سے پیدا کیا ہے۔ اور اللہ کا ارشاد ہے تم سب میں زیادہ عزت والا اللہ کے نزدیک وہی ہے جو سب سے زیادہ تقویٰ والا ہے''۔

''انسانی افعال کے سلسلہ میں اگر شریعت کسی چیز سے روکتی ہے یا اسکی برائی کرتی ہے یا اسکے چھوڑنے کا مشورہ دیتی ہے تو اسکی مراد یہ نہیں ہوتی کہ اسے بالکل ہی چھوڑ دیا جائے یا اسکی جڑ ہی اکھاڑ کر پھینک دی جائے اور جن قوتوں سے یہ افعال انجام دئے جاتے ہیں ان کو بالکل ہی معطل کر دیا جائے۔ بلکہ شریعت کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ ان افعال کو مقدور بھر صحیح اور جائز اغراض میں پھیر دینا چاہئے تا کہ ان کا مصرف صحیح اور جائز ہو اور تمام مقاصد دائرہ حق میں آجائیں۔ مثلاً شریعت نے اس لئے غصہ کی برائی نہیں کی کہ اسکو بالکل ہی ختم کر دیا جائے کیونکہ اگر انسان بالکل ہی قوت کھو بیٹھے تو حق کے لئے انتقام لینے پر کیسے قادر ہوگا اور جہاد کس طرح کرے گا۔ اگر برے مقاصد کے لئے غصہ ہے تو وہ واقعی قابل نفرت و مذمت ہے لیکن اگر اللہ کے دین کے بارے میں اور اللہ کے قانون کے احترام کو برقرار رکھنے کے لئے ہے تو بلاشبہ غصہ قابل تعریف و تحسین ہے۔ یہی حال عصبیت کا ہے۔''

> عصبیت ایک اندرونی کیفیت ہے۔ کسی فرد یا گروہ، قوم، قبیلے یہاں تک کہ معتقدات، اصول و مبادی، نظریات و افکار کے دفاع کا داخلی نظم ہے لیکن تعصّب کا رخ ہمیشہ اندر سے باہر یعنی دوسروں کی طرف ہوتا ہے۔ اس سے ہٹ کر بعض کے نزدیک عصبیت پہلے پہل مثبت جذبہ کے طور پر مستعمل تھی بعد میں اسکا اطلاق منفی جذبہ پر بھی ہونے لگا لیکن تعصب یقینی طور پر صرف منفی جذبہ ہی کے لئے مستعمل رہی ہے۔

عصبیت و تعصب کی مختلف اقسام پائی جاتی ہیں جیسے کہ مذہبی، مسلکی و جماعتی و گروہی، صوبائی و علاقائی و وطنی (جو ریجنلزم یا نیشنلزم کی بنیاد ہے)، نظریاتی، نسلی اور لسانی وغیرہ اور یہ تمام صرف حق و انصاف ہی کی حدود میں محمود ہیں اور ظلم و ناانصافی کی حدود میں غیر محمود۔

کیسے پہچانیں کہ کوئی متعصب ہے؟

سائیکوتھیراپسٹس کے نزدیک مندرجہ ذیل ۷ عادتیں ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ آیا کوئی متعصب ہے یا نہیں؟

۱۔ ایسا شخص جو شدت پسند ہے ایسا شخص کسی بھی معاملہ کی گہرائی و گیرائی تک نہیں پہونچتا اور

تعصب اور اس کا حل

علم نفسیات کی رو سے

شجاع الدین فہد انعامدار

ایک ۱۹ سال کا نوجوان شلوار کرتے میں ملبوس اور سر پر ٹوپی لگائے ہوئے اپنے بھائی کے ساتھ ریلوے پلیٹ فارم پر کھڑا تھا۔ دور سے ہی اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ وہ کس مذہب یا فرقہ سے تعلق رکھتا ہے۔ جیسے ہی ٹرین پلیٹ فارم پر آ کر رکی، ہر طرف افراتفری مچ گئی۔ ہر کوئی جلد از جلد سیٹ حاصل کرنا چاہتا تھا، اور سیٹ کی اسی دوڑ میں جھگڑے بھی شروع ہو گئے۔ اس نوجوان کی بھی سیٹ کے لئے کسی مسافر سے لڑائی ہو گئی، اور یہ تنازعہ اتنا بڑھ گیا کہ اختتام اس نوجوان کی موت پر ہوا۔ یہ کام ٹرین میں موجود بھیڑ نے کیا، ہجومی تشدد یا Mob Lynching کا واقعہ۔ جو ہجوم حملہ آور ہوا، نہ صرف اسے مارا بلکہ غدار، دہشت گرد اور پاکستانی جیسے القاب سے بھی نوازا۔ اس واقعہ میں نوجوان کی موت اور اس کے بھائی کو شدید چوٹیں آئیں۔ اس قدر مایوس کن واقعہ سننے میں تو کوئی افسانہ لگتا ہے، مگر حقیقت یہ ہے کہ ایسے واقعات اب ہندوستانی سماج میں قدرے عام ہو چکے ہیں۔ یہ واقعہ بہتیرے سوالات کھڑے کرتا ہے۔ قتل کی وجہ کیا ہو گی؟ جگہ کی بحث میں پاکستانی اور دہشت گرد کے طعنے کہاں سے آئے؟ کیا واقعی یہ جگہ کا مسئلہ تھا؟ یا کیا واقعی وہ دونوں نوجوان دہشت گرد تھے وغیرہ وغیرہ؟ ان سوالات کے جوابات سے قبل ایک اور کہانی ملاحظہ کر لیجئے۔

مجاہد کا داخلہ اپنے شہر سے دور ایک اعلیٰ تعلیمی ادارے میں ہوا۔ داخلہ کی کاروائی مکمل کرنے کے بعد وہ کالج کے نزدیک کمرہ کی تلاش میں نکلا۔ وہ تقریباً دس سے زائد کمرہ مالکان کے پاس گیا، مگر جواب منفی رہا۔ اگلی بار اپنا نام اور پہچان چھپاتے ہوئے جب اس نے ایک مالک سے بات کی تو وہ کمرہ دینے پر تیار ہو گیا۔ مجاہد نے اپنے کاغذات اس کو دیئے، جو اس کا نام اور پہچان ظاہر کرتے تھے۔ مالک نے کہا کہ

معاملہ کو ایک سے زیادہ زاویہ ہائے نگاہ سے دیکھنے سے قاصر رہتا ہے اور اپنی محدود و تنگ نظری کی اساس پر فیصلہ کرتا ہے اور اپنی ہی رائے کو مقدم سمجھتا ہے اور اس سے مختلف آرا رکھنے والے کو غلط اور دشمن سمجھتا ہے۔

۲۔ ایسا شخص جو نفسیاتی طور پر غیر لچک دار ہے معاملہ کو دوسرے نقاط نظر سے دیکھنا اس کو سخت متفکر اور خوفزدہ کر دیتا ہے اور سامنے والے کو ہم خیال و متفق بنانے کے لئے کسی بھی حد تک جانے تیار ہوتا ہے۔

۳۔ ایسا شخص جو خود کو عالمِ کل 'I know it all' سمجھتا ہے اور اپنی تنگ نظری کی بنا پر سخت جارحانہ موقف اختیار کرتا ہے۔

۴۔ ایسے افراد جو دوسروں کو سماعت کرنے کا مادہ اپنے اندر نہیں رکھتے۔

۵۔ ایسے افراد کے تعلقات نہایت خراب ہوتے ہیں۔ ان کے تعلقات صرف انہی لوگوں سے اچھے ہوتے ہیں جو ان کی بات مانیں، ان کے تابع رہیں اور ان کی اطاعت و ماتحتی کریں۔

۶۔ ایسے افراد کے نزدیک دنیا صرف Binary ہوتی ہے یعنی یا تو صرف سفید ہوتی ہے یا کالی۔ وہ دونوں کے مجموعہ پر یا درمیانی یا سرمئی رنگ پر یقین نہیں کرتے۔

۷۔ ایسے افراد حاسد ہوتے ہیں اور کبھی امن و چین کی حالت میں نہیں رہتے۔

تعصب کا حل کیا ہے؟؟ تعصب نفرت ہی کی ایک شکل ہے اور نفرتوں کا مقابلہ ہمیشہ محبتوں ہی سے کیا جاتا ہے محبت کو پروان چڑھانے کے لئے ضروری ہے دو باہم متحارب گروہوں کو آپس میں ایک دوسرے کو جاننے، ایک دوسرے کے اعادات و اطوار، عقائد و رسومات سے واقف ہونے کے مواقع فراہم کئے جائیں، غلط فہمیوں کا ازالہ کیا جائے اور معاملات کو سلجھانے کے لئے حق و انصاف کو معیار بنانے کی طرف توجہ دلانا چاہئے۔ انکی وسعت نظر کے لئے ان میں حقائق کو سامنے لانا اور جھوٹی و غلط معلومات کو دور کرنا چاہئے معتدل و تعمیری سوچ و فکر کو فروغ دینا چاہئے جو افراد و تنظیمیں امن کو اور حقوق انسانی کے لئے کام کر رہے ہیں ان کی ہمت افزائی اور ان کا تعاون کرنا چاہئے۔ جو مظلوم افراد تعصب کا نشانہ ہوئے ہیں ان کی مدد کرنا اور ان کو انصاف کو دلانے کے لئے کوشش کرنا چاہئے، ان کی قانونی امداد کرنا چاہئے۔ نفرت کے سوداگروں کی شناخت اور انہیں قانون کے شکنجہ میں کسنے کے لئے اقدام کرنا چاہئے۔ منتخب نمائندے اور تمام گروہوں کے ذمہ داران سے تعلقات کو استوار رکھنا اور ناگہانی صورتحال میں صحیح رخ میں عمل کرنے کے لئے ان پر دباؤ ڈالنا چاہئے۔ دونوں گروہوں کو مشترکہ مقاصد کے حصول کے لئے تگ و دو کرنے کے لئے آمادہ کرنا چاہئے تو امید ہے کہ تعصب کی فضا دور ہو گی اور محبتوں کا راج ہو گا۔ جیسا کہ اقبال نے کہا۔

محبت کے شرر سے دل سراپا نور ہوتا ہے
ذرا سے بیج سے پیدا ریاض طور ہوتا ہے
محبت ہی سے پائی ہے شفا بیمار قوموں نے
کیا ہے اپنے بخت خفتہ کو بیدار قوموں نے

جب وہ اپنا سامان لے آئے تو پیشگی کرایہ ادا کرے۔ مگر سامان لئے جب مجاہد وہاں پہنچا تو حیرت کی انتہا نہ رہی جب مالک نے اس سے کہا ''مجھے لگا کہ آپ نہیں آؤ گے، اس لئے میں نے وہ روم کسی اور کو دے دیا۔'' آخر کار مجاہد کو کالج سے بہت دور اپنی ہی برادری کی کسی بستی میں کمرہ حاصل کرنا پڑا۔ اس واقعہ کے ضمن میں بھی کئی سوالات اٹھتے ہیں۔ کیا واقعی کمرے خالی نہیں تھے؟ اگر تھے تو مالکان کیوں مجاہد کو کمرہ دینا کیوں نہیں چاہتے تھے؟ کمرے کی کمی کا مسئلہ اسے دوسری بستی میں کیوں نہیں پیش آیا؟

مندرجہ بالا دونوں واقعات ہندوستانی سماج کی سچائی دکھاتے ہیں۔ دونوں ہی واقعات کے ضمن میں پوچھے گئے سوالات کے جوابات بھی نہایت آسان ہیں، جو معمولی عقل کا استعمال کر کے بھی دیئے جا سکتے ہیں۔ لیکن زیر نظر مضمون میں اس موضوع کے علمی و نفسیاتی پہلوؤں کا جائزہ لیا جائے گا۔ اس مسئلہ کا تعلق سماجی نفسیات (Social Psychology) سے ہے، جس میں افراد کے مجموعی برتاو کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔ ہمارے سماج میں اس طرح کا سماجی رجحان دقیانوسی تصورات (Stereotype)، تعصب (Prejudice)، یا تفریق (Discrimination) کہلاتا ہے۔

دقیانوسی تصورات (Stereotype): ایک مخصوص گروہ کے افراد کے بارے میں عام رائے قائم کرنا۔ جس میں کچھ خصوصیات گروہ کے ہر ممبر سے وابستہ کر دی جاتی ہیں۔ قطع نظر اس سے کہ ان کے درمیان انفرادی سطح پر کیا تغیرات پائے جاتے ہیں۔ (Aronson)۔ یہ دراصل ایک ذہنی عمل ہے، جس میں انسانوں کے کسی گروہ کے بارے میں ایک خیالی تصویر بنالی جاتی ہے، جو مثبت اور منفی دونوں ہو سکتا، جس کا انحصار اس بات پر ہوگا کہ آپ اسے پسند کرتے ہیں یا ناپسند۔

تعصب (Prejudice): کسی گروہ اور اس کے ممبران کے بارے میں ذہن میں بیٹھے منفی فیصلے تعصب کہلاتے ہیں۔ (Mayers)۔ تعصب دراصل وہ منفی جذبات و احساسات ہیں جو کسی گروہ کے بارے میں منفی Strereotype کی وجہ سے ظاہر ہوتے ہیں۔ جو ہمیں اس گروہ کے بارے میں منفی رویہ یا عمل رکھنے پر آمادہ کر سکتے ہیں۔

تفریق (Discrimination): کسی مخصوص گروہ کے ممبران کی جانب منفی، غیر منصفانہ اور نقصاندہ رویہ رکھنا تفریق کہلاتا ہے۔ اس میں فرد کی سیرت و کردار کو نظر انداز کر کے محض اس کے کسی گروہ سے متعلق ہونے کی بنیاد پر فیصلہ کیا جاتا ہے۔ (Gilovic)۔ تفریق دراصل ذہن میں موجود تعصب پر کاروائی کا رجحان ہے۔

Stereotype خاص طور پر ذہن اور خیالات سے متعلق ہے، جو اچھا اور برا دونوں قسم کا ہوتا ہے۔ منفی Stereotype سے تعصب جنم لیتا ہے۔ تعصب میں فرد منفی جذبات یا احساسات سے مغلوب ہو کر منفی فیصلے لیتا ہے اور تفریق تعصب پر عملی اقدام کا نام ہے۔ گویا یہ ایک لڑی ہے۔

کرتا پاجامہ اور ٹوپی والے لڑکے کی مثال لیں تو Stereotype کی رو سے وہ ایک مسلم لڑکا گردانہ گیا۔ اب یہ افراد پر منحصر تھا کہ وہ مسلمانوں کو کیا سمجھتے ہیں۔ کسی فرد کے نزدیک مسلمان سچے اور ایماندار ہو سکتے ہیں اور کسی دوسرے فرد کے لئے وہی مسلمان دہشت گرد اور قوم کے غدار ہو سکتے ہیں، یہی منفی اور مثبت Stereotype ہیں۔ اسی طرح تعصب سوچ اور عقائد پر کام کرتا ہے۔ ہر سوچ کے ساتھ ہمارے احساسات جڑے ہوتے ہیں، اگر فرد کے ذہن میں کسی گروہ کے متعلق منفی جذبات و احساسات ہوں، جیسے نفرت، کینہ، بدلے کے جذبات وغیرہ تو اسے تعصب کہیں گے اور جس زنجیر کی آخری لڑی سماجی تفریق ہے جس میں جذبات و احساسات پر عمل آوری ہوتی ہے۔ جتنے قوی احساسات ہوں گے اتنا ہی شدید اس کا ردّعمل ہوگا۔ کسی معاملے میں وہ قتل ناحق ہو سکتا ہے اور کسی دوسرے معاملے میں روم کرایہ پر نہ دینا۔ ہمارے سماج میں گونا گوں قسم کے تعصّبات موجود ہیں، جیسے ذات پات کی بنیاد پر تعصب، مذہبی تعصّبات، سماجی و معاشی سطح پر تعصب، جغرافیائی تعصب، سیاسی تعصب، لسانی تعصب وغیرہ وغیرہ۔ مختصر یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہر اختلاف جو سماج میں گروہ بندی کی بنیاد ہے سماج میں تعصب اور تفریق پیدا کرتا ہے۔

تعصب کے اقسام: تعصب کی دو اقسام ہیں۔ واضح تعصب (Explicit / Overt) اور دوسرا غیر واضح تعصب (Implicit / Subtle)۔ جیسا کہ ناموں سے ہی ظاہر ہے کہ جو تعصب کھلے طور پر واضح ہو جائے وہ واضح یا کھلا تعصب ہے، اور جو ڈھکے انداز میں سامنے آئے وہ غیر واضح۔ جیسے پہلے واقعہ میں تعصب واضح تھا جبکہ مجاہد کے واقعے میں غیر واضح۔ چونکہ بہت سارے ممالک میں تعصب کی بنا پر تفریق غیر قانونی ہے، اس لئے ڈھکے چھپے انداز میں تعصب کا کھیل کھیلا جاتا ہے، اس لئے غیر واضح تعصب کو جدید تعصب بھی کہتے ہیں۔

تعصب کے محرکات: تعصب کو ختم کرنے کے لئے اس کی وجوہات کا علم نہایت ضروری ہے۔ تعصب کے پیدا ہونے کے تین محرکات ہیں۔

ا۔ **سماجی محرکات:** تعصب کو پنپنے کے لئے جو سماجی محرکات مدد کرتے ہیں وہ تین ہیں۔

فرد کا سماجی کرن (Socialisation): یہ دراصل ایک عمل ہے جس کے ذریعے فرد اپنی تہذیب کے قوانین، اصول و مبادی اور رویوں کو سیکھتا اور اپناتا ہے۔ Cambridge dictionary of Psychology۔ یہ خاص طور پر بچپن میں ہوتا ہے۔ لیکن سیکھنے اور اپنانے کا یہ عمل پوری زندگی جاری رہتا ہے، جس میں فرد سماجی اور تہذیبی قدریں، اصول و عقائد اور رویوں کے ساتھ ساتھ غیر محسوس طریقے سے تعصب بھی سیکھتا ہے۔ سماجیانے کا یہ عمل فرد کی ذہنی ترقی، احساس و رویوں میں اہم رول ادا کرتا ہے۔ یہ عمل والدین، بھائی بہن، دوست احباب اور ذرائع ابلاغ کے ذریعے ہوتا ہے۔ سماجی کرن کا یہ عمل تین طریقوں سے تعصب پیدا کرتا ہے۔

آمرانہ شخصیت: بچوں کو بچپن میں سختی کی جائے اور ان کی آزادی سلب کر لی جائے تو نفسیاتی طور پر ان میں آمرانہ شخصیت پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ تمام دنیا کے لوگوں کو اپنے گروہ کے زیر اثر دیکھنا چاہتے ہیں۔ اور یہی چیز تعصب کو جنم دیتی ہے۔ آمرانہ شخصیت دائیں بازو کے نظریات کے حاصل افراد میں زیادہ دیکھنے کو ملتی ہے۔

مذہب اور تعصب: مذہب کی بنیاد پر پیدا ہونے والے تعصب کی وجہ دراصل سطحی عقیدہ ہوتا ہے۔ جیسے یہودیوں کی سوچ کہ وہ اللہ کے محبوب بندے ہیں اور اپنی کھوئی ہوئی سماجی حیثیت حاصل کرنا ہی ان کا کام ہے۔ یہ ان کے اندر تعصب پیدا کرنے کی وجہ بنی۔ ایک جانب مذہب کا نام لے کر تعصب کو بڑھانے کی کوشش ہوئی ہے جبکہ دوسری جانب یہ بات بھی دیکھنے میں آئی ہے کہ مذہب کے سچے پیروکار اور خدا کے عبادت گذار بندوں کے درمیان عام طور سے بہت کم تعصب پایا جاتا ہے۔

طبقاتی مطابقت (Conformity): یہ دراصل اپنے سماجی گروہ کے اصولوں اور قدروں

کے ساتھ مطابقت کی بنا پر پیدا ہونے والا تعصب ہے۔ کس مخصوص گروہ کی سماجی قبولیت اور معاشرے میں اس کی پسندیدگی کی وجہ سے سماجی مطابقت بڑھتی ہے، یہ دیکھنے میں آیا ہے کہ جو سماجی قدروں کو حد سے زیادہ اہمیت دیتے ہیں وہ زیادہ متعصب ہو جاتے ہیں۔ موجودہ سماجی قدریں وقت کے ساتھ تبدیل ہوتی ہیں، جس طرح فیشن اور رجحانات تبدیل ہوتے ہیں، اس لئے یہ امید کی جاسکتی ہے کہ ایسے سماجی اصول بنائے جائیں جو تعصب کو کم کرسکیں، ہوسکتا ہے کہ ہم ایک تعصب سے پاک معاشرے کا خواب دیکھ سکیں۔

۲۔ **سماجی عدم مساوات:** سماج میں عدم مساوات تعصب پیدا کرتی ہے۔ ہندوستانی سماج، طبقاتی نظام پر مبنی ہے، جو عدم مساوات اور ناانصافیوں کو پیدا کرتا ہے اور جس کے نتیجے میں تعصب بڑھتا ہے۔ Social Dominance Theory یہ کہتی ہے کہ ہر شخص چاہتا ہے کہ اس کا سماجی گروہ دیگر سماجی گروہ پر غالب رہے۔ اس کی نظر میں سماج کی ایک ایسی درجہ بندی ہوتی ہے جس میں اس کا گروہ سب سے اوپر ہوتا ہے۔ یہی چیز ذات پات کے نظام میں نسلی برتری اور صنفی تعصب میں دیکھنے کو ملتی ہے۔

۳۔ **ادارہ جاتی محرکات:** بعض دفعہ سماجی ادارے جیسے اسکول، کالج، حکومتی ادارے اور میڈیا اپنی تفرقہ ڈالنے والی پالیسیوں کے ذریعے تعصب کو بڑھانے میں مدد کرتے ہیں۔ یہ دراصل اکثریت کی مانگ جو سامنے رکھ کر بھی کیا جاتا ہے۔ جیسے اسکول کی درسی کتابوں میں نفرت پھیلانے والے مواد کو ڈالنا اور میڈیا کا سب سے زیادہ وقت ہندو یا مسلم ایشوز کے لئے مختص کرنا۔ حکومتی ادارے ہندوتوا کے شیطانی ایجنڈا کے لئے اپنی پالیسی اور اقدامات سے کام کررہے ہیں۔ تعصب کی یہ ادارہ جاتی شکلیں سب سے زیادہ خطرناک، دیرپا اور عوام کی زیادہ تعداد کو متاثر کرنے والی ہیں۔

۴۔ **ترغیبی محرکات:** یہ مندرجہ ذیل ہوسکتے ہیں۔

غصہ اور مایوسی (Scapegoat Thoery): مقاصد اور ضروریات کے حصول میں رکاوٹ کی وجہ سے غصہ اور مایوسی پیدا ہوتی ہے۔ اس مایوسی اور غصہ کا اظہار تعصب کی صورت میں ہوتا ہے۔ وسائل زندگی اور نوکریوں کی فراہمی، ضرورتوں اور رتبہ، قوت کی چاہ ان سب چیزوں کے لئے مقابلہ مایوسی پیدا کرتا ہے۔ اس لئے جیسے جیسے ہی مقابلہ کے شرکا کی تعداد بڑھتی ہے مایوسی بھی بڑھتی جاتی ہے۔ جس کی وجہ سے کسی خاص گروہ کے خلاف تعصب بڑھتا ہے۔ اس لئے جہاں فوائد کے حصول کے لئے تصادم ہوگا نتیجہ تعصب کی صورت میں رونما ہوگا۔ یہی Realistic Group Conflict Theory ہے۔ مثال کے طور پر ممبئی میں شمالی بھارت کے لوگوں تئیں تعصب۔ اسی طرح ہندوستانی میں بے روزگاری کی شرح بہت زیادہ ہے، جو تعصب میں اضافہ کا باعث ہوسکتی ہے۔ خاص طور پر فرقہ وارانہ تعصب ملک میں ریزرویشن دینے کی وجہ سے نچلی ذاتوں کے خلاف اونچی ذاتوں میں پایا جاتا ہے۔ یہ مسئلہ روزگار کی شرح بڑھانے اور معاشی بحران کے خاتمے کے بعد ہی قابو میں لایا جاسکتا ہے۔

سماجی شناخت کا نظریہ Social Identity Theory: میں کون ہوں؟ اس سوال کا جواب ہمارے سماج کی رو سے ہماری گروپ ممبر شپ سے آتا ہے۔ ہم افراد کو پہچاننے کے لئے انہیں مختلف گروہوں میں تقسیم کرتے ہیں۔ جیسے ہندو، مسلم، ڈاکٹر، بس ڈرائیور وغیرہ۔ کسی فرد کے بارے میں کچھ دیگر باتوں کو کہنے کا یہ ایک آسان طریقہ ہوتا ہے۔ ہم اپنے آپ کو کچھ گروہوں سے منسلک کرکے خود اعتمادی حاصل کرتے ہیں۔ ہم اپنے گروہ اور دوسرے گروہوں کا موازنہ کرکے خود کو برتر سمجھتے ہیں۔ یہ احساس دوسروں سے ناپسندیدگی اور تعصب کو جنم دیتا ہے۔

۴۔ **ذہنی محرکات:** یہ مندرجہ ذیل ہوسکتے ہیں۔

Stereotype: اس ضمن میں گفتگو آچکی ہے، کہ کس طرح ذہنی سطح پر تعصب پیدا کرنے کا عامل یہی ہے۔

منفرد نظر آنا Distinctiveness: اپنے خاص رہن سہن، لباس، رکھ رکھاو، زبان اور ساخت وغیرہ کے اعتبار سے سماج میں کچھ لوگ منفرد نظر آتے ہیں، جس کی وجہ سے ان کی ہر حرکت پر نظر رکھی جاتی ہے۔ اور پھر انکے بارے میں مبالغہ آرائی سے کام لیتے ہوئے انہیں ایک گروہ گردانتے ہوئے، ان سے تعصب برتا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر کالج کیمپس میں طالبعلم کا کرتا اور ٹوپی میں نظر آنا۔

خود شعور Self Consciousness: منفرد اور مخصوص ہونا خود شعوری کو پروان چڑھاتا ہے جس کی وجہ سے افراد خود کو دیگر سماج میں مختلف اور کمتر محسوس کرتا ہے، اور سماج کے افراد کے سلسلے میں غیر ضروری تعصب کا تصور کرتے ہوئے، ان سے متعصب ہو جاتا ہے۔ ایک امریکی تجربہ میں ایک لڑکی کے چہرے کو میک اپ کے ذریعے داغدار بنایا گیا اور لوگوں سے ملاقات کرائی گئی۔ ان ملاقاتوں میں رفتہ رفتہ اس داغ کو مٹایا گیا۔ لڑکی کے خیال کے مطابق اس داغ کے باعث لوگوں نے اس سے متعصب برتا، مگر ویڈیوگرافی کے ذریعے جو نتائج سامنے آئے اس میں لوگوں کی جانب سے ایسا کوئی رویہ نہیں نظر آیا بلکہ وہ لڑکی Distinctiveness کا شکار ہوئی۔ اس طرح اکثر مسلمانوں کا بھی معاملہ ہوتا ہے۔

تعصب کا حل: (۱) سماجی میل جول یا Socialisation کو نفرت کا نہیں بلکہ سیکھنے کا ذریعہ بنانا چاہیئے۔ ماں کی گود سے ہماری تربیت کچھ اس طرح سے ہوکہ ہمارے بچے کسی بھی طرح کا تعصب نہ سیکھیں۔ لڑکوں اور لڑکیوں کے سامنے ایسی کوئی بات کریں۔ جس سے ان میں بچپن ہی سے صنفی تعصب پیدا ہو۔ ہمارے والدین اور اساتذہ کو حد درجہ محتاط رہنا ہوگا کہ وہ کسی گروہ کے بارے میں نفرت آمیز بات بھی اپنی زبان سے نہ نکالیں۔

(۲) سماجی روابط: جب تک سماج کے افراد Ghettos میں رہیں گے تو تعصّبات شدید ہوتے جائیں گے۔ سماج میں افراد اور مختلف گروہوں کے درمیان تعلقات کو بہتر کرنا ہوگا۔ لوگوں کو گروہ بندی کے بجائے انسان کی حیثیت سے دیکھنے کی ضرورت ہے۔

(۳) نو درجہ بندی Recategorisation: نو درجہ بندی، نئے گروہوں کو بنانا نہیں بلکہ اپنی حدود کو وسعت دینا ہے۔ مثال کے طور پر اگر ہم دیکھیں کہ ریاستوں کے مابین کرکٹ مقابلے منعقد ہوں تو ہم ریاست کی طرفداری کرتے ہیں، جبکہ مقابلہ اگر ملکی ٹیم کا کسی غیر ملکی ٹیم سے ہو تو ریاستوں کو بھول کر ہم ملک کی ٹیم کو سپورٹ کرتے ہیں۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ گروہ کی حدود جتنی زیادہ وسیع ہوں گی تعصب اتنا ہی کم ہوتا جائے گا۔

(۴) احساس جرم: بیشتر افراد جو تعصب برتتے ہیں، اس بات کا ادراک ہی نہیں رکھتے کہ وہ متعصب ہیں اور دوسرے کے ساتھ ان کا رویہ عدل سے خالی ہے۔ یہ احساس جرم پیدا ہونے کے بعد ہی ان میں تبدیلی کی توقع کی جاسکتی ہے۔ اس کے لئے کاونسلنگ سینٹر اور سماجی بیداری کے پروگرام منعقد کئے جاسکتے ہیں۔

ہر شخص کسی نہ کسی درجہ میں متعصب ہے، جو ایک نفسیاتی مرض ہے، اور اس مرض سے چھٹکارا پانے کی ملک وملت کو سخت ضرورت ہے۔

نظر

تعصب

فلسفیانہ اور عمرانی تناظر

ڈاکٹر محمد رفعت

اپنی فطری داعیات کے سبب انسان اجتماعی زندگی گزارتا ہے۔ اجتماعی زندگی کی ابتدا خاندان سے ہوتی ہے۔ چنانچہ ہر شخص کسی نہ کسی خاندان سے تعلق رکھتا ہے۔ دنیا میں جب قبائلی نظام رائج تھا تو ہر فرد اپنے خاندان کے علاوہ کسی نہ کسی قبیلے سے بھی وابستگی رکھتا تھا (کیونکہ ہر قبیلہ متعدد خاندانوں پر مشتمل ہوتا تھا)۔ اب بھی دنیا کے بہت سے خطوں میں قبائلی نظام موجود ہے۔ خاندانی اور قبائلی شناخت کی طرح، انسانوں کی نسلی شناخت بھی ہوتی ہے مثلاً ہمارے ملک میں آریہ نسل سے تعلق رکھنے والے افراد بھی ہیں اور دراوڑ نسل کے بھی۔ اسی طرح باہمی تعارف کراتے وقت اشخاص اپنے علاقے اور ملک کا بھی ذکر کرتے ہیں چنانچہ مثال کے طور پر ایک شخص کے تعارف میں بتایا جاتا ہے کہ وہ ایشیائی ہے یا امریکی، ہندوستانی ہے یا چینی اور بنگالی ہے یا پنجابی۔ علاقے اور ملک کے علاوہ زبان بھی گروہوں کی شناخت کی بنیاد بنتی ہے چنانچہ عربی بولنے والے ایک لسانی گروہ سمجھے جاتے ہیں اور تمل بولنے والے دوسرا لسانی گروہ۔ انسانوں کی اجتماعی پہچان کی یہ چند مثالیں ہیں جن میں خاندان، قبیلہ، نسل، زبان اور علاقے کے اشتراک کی بنا پر افراد میں ایک گروہ ہونے کا احساس پیدا ہوتا ہے۔ انسانوں میں اس نوعیت کا فرق، فطری اسباب سے وجود میں آتا ہے اس لیے ان مختلف انسانی گروہوں میں کسی کو دوسرے سے برتر یا کم تر قرار نہیں دیا جا سکتا۔ ایسا کرنا عقل کے خلاف ہوگا۔ ظاہر ہے کہ نسل، مادری زبان، پیدائشی وطن اور خاندان کا انتخاب، کسی فرد کے اختیار میں نہیں۔ یہ خالقِ کائنات کی مشیت ہی طے کرتی ہے کہ کون شخص کس خاندان میں پیدا ہوگا اور اس خاندان کا تعلق کس نسل، قبیلے اور خطے سے ہوگا۔ اس معاملے میں اس فرد سے کوئی رائے نہیں لی جاتی، جو خصوصیات، فرد کے اکتساب کا نتیجہ نہ ہوں بلکہ خالصۃً، مشیتِ الٰہی سے کسی شخص کو ملی ہوں، اُن پر فخر کرنا، انتہائی نادانی کی بات ہے۔ اس طرح ان خصائص کے فرق کو انسانوں کے درمیان معزز اور غیر معزز کی تقسیم کی بنیاد بنانا بھی بے عقلی ہے۔ تاہم یہ حیرت انگیز واقعہ ہے کہ دنیا میں یہ نادانی پہلے بھی عام تھی اور آج بھی عام ہے۔

تعصب کے معنی:

آج بھی سفید نسل والے، کالے رنگ والوں کو کم تر سمجھتے ہیں۔ جاہلیت کے دور میں عرب والے باقی ساری دنیا کے مقابلے میں زبان دانی میں اپنے کو برتر سمجھتے تھے چنانچہ غیر عرب گروہوں کو عجمی قرار دیتے تھے (یعنی وہ جو بولنا نہیں جانتے)۔ ہمارے ملک میں پیدائش کی بنیاد پر انسانوں کو اونچا اور نیچا سمجھا جاتا ہے۔ دنیا کی بہت سی قوموں میں یہ غلط خیال عام ہے کہ تہذیب کی ترقی میں صرف اُن کی قوم نے اہم رول ادا کیا ہے اور باقی ساری اقوام، محض تقلید کرتی رہی ہیں۔ اس طرح کے غلط خیالات کو تعصب کہا جاتا ہے۔

تعصب — یعنی اپنے گروہ کو برتر اور دوسرے گروہ کو کم تر سمجھنے سے عملی خرابیاں بھی جنم لیتی ہیں۔ انسان اپنے گروہ کی بے جا طرف داری اور حمایت کرتا ہے اور دوسرے گروہوں کے حقوق پر دست درازی کرتا ہے۔ اس طرح فکر و خیال کی کجی، عملی فساد کی شکل اختیار کرتی ہے۔ ظاہر ہے کہ تعصب کے یہ فکری و عملی مظاہر، انسانی سماج کے امن و امان کے لیے مستقل خطرہ ہیں۔ تعصب کے نتیجے میں بے انصافی اور ظلم ہوتا ہے، گروہ باہم ٹکراتے ہیں اور انسانی وسائل اور توانائی کسی مفید کام میں صَرف ہونے کے بجائے تصادم کی نذر ہو جاتی ہے۔ جب کسی متعصب گروہ کو اقتدار مل جاتا ہے تو اس کے ظلم کا دائرہ وسیع ہو جاتا ہے۔ وہ مختلف حربوں سے دوسرے گروہوں کو نقصان پہنچانے کی کوشش کرتا ہے۔ اس طرح کی ظالمانہ حرکات کا ردِ عمل بھی اکثر سامنے آتا ہے اور تعصب سے متاثر خطہ، خانہ جنگی کی کیفیت سے دوچار ہونے لگتا ہے۔ انسانی تاریخ میں تعصب کے برے اثرات کی مثالیں موجود ہیں جو عبرت کا سامان ہیں۔ خود آج کی دنیا بھی تعصب کے تباہ کن نتائج کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہی ہے۔

فلسفیانہ تناظر:

اپنے فکر وعمل میں انسان جو رویہ بھی اختیار کرتا ہے اُس کی بنا— اُس مخصوص تصورِ حیات وکائنات اور تصورِ انسان پر ہوتی ہے، جس کو وہ درست سمجھتا ہے۔ اگر حیات و کائنات کے بارے میں اور انسانی وجود کے سلسلے میں انسان کا نقطہ نظر، آفاقی نوعیت کا ہو تو اس کی شخصیت تعصب سے بلند ہوتی ہے۔ اُس کی فکر کی نشوونما عقلی استدلال کے ذریعے ہوتی ہے اور اُس کا عمل، صحت مند محرکات کا تابع ہوتا ہے۔ اس کے برعکس، اگر حیات وکائنات اور انسانیت کے متعلق، کسی شخص کا تصور— آفاقی نہ ہو بلکہ تنگ نظری پر مبنی ہو تو اُس کے افکار واعمال میں بھی سطحیت، تنگ دلی اور پستی کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ ایسا شخص، آسانی سے تعصب میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

حیات وکائنات اور انسانیت کے سلسلے میں تین نقطہ ہائے نظر موجود ہیں، یعنی الحاد، شرک اور توحید۔ الحاد اور شرک— انسان کو تنگ نظری اور تنگ دلی کی طرف لے جاتے ہیں جبکہ توحید کے قائل فرد کی شخصیت بلند اور پاکیزہ ہوتی ہے۔ الحاد اور شرک کا طرزِ فکر، آفاقیت کی نفی کرتا ہے جبکہ توحید، آفاقیت کا اثبات ہے۔ الحاد اور شرک کو اختیار کرنے والا ظاہر بینی کی طرف مائل ہوتا ہے جبکہ توحید پر یقین رکھنے والا حقائق کا درست ادراک کرتا ہے۔

کھویا نہ جا، صنم کدہ کائنات میں
محفل گداز، گرمی محفل نہ کر قبول

انسانوں اور اشیاء سے تعلق:

انسان تعلقات سے گھرا ہوا ہے۔ سب سے پہلے تو اس کا ہمہ وقت تعلق خود اپنے نفس سے ہوتا ہے یعنی وہ اپنے وجود کا احساس رکھتا ہے اور اپنے خیالات، جذبات اور تمناؤں کے عالمِ اصغر میں اُس کی شعوری زندگی گزرتی ہے۔ پھر انسان، اپنے جیسے دوسرے انسانوں سے بھی تعلق رکھتا ہے۔ انسانی روابط، وسیع اور متنوع ہوتے ہیں۔ اپنی پوری زندگی میں ایک شخص کا، انسانوں سے مسلسل واسطہ پیش آتا ہے۔ انسانوں میں اُس کے دوست بھی ہوتے ہیں اور دشمن بھی۔ بہت سے افراد سے وہ لین دین کرتا ہے، تعاون حاصل کرتا ہے اور تعاون پیش کرتا ہے، عہد و پیمان باندھتا ہے اور سماجی و سیاسی امور میں اشتراک کرتا ہے۔ انسانوں کے علاوہ، ایک شخص کا کائنات کی اشیاء سے بھی تعلق ہوتا ہے اس لیے کہ وہ اُن اشیاء کے خواص معلوم کرتا ہے اور اُن کو اپنے کام میں لاتا ہے۔ اپنے آپ سے، دوسرے انسانوں سے اور دنیا کی چیزوں سے ان تعلقات کی استواری کے نتیجے میں انسان کو نئے تجربات حاصل ہوتے ہیں اور اس کی عقلی نشوونما ہوتی ہے۔ انسان کی فکر ونظر کی تشکیل میں اس کے یہ تجربات، بڑی اہمیت رکھتے ہیں اور انسانی شعور کو کوئی خاص رخ دینے میں کلیدی رول ادا کرتے ہیں۔

مندرجہ بالا روابط وتعلقات وسیع بھی ہیں اور متنوع بھی، تاہم ان میں ایک محدودیت پائی جاتی ہے جس کی وجہ ان روابط کی سطح ہے۔ اصولی اعتبار سے سارے انسان ایک سطح پر ہیں چنانچہ جب ایک شخص اپنے بارے میں یا دوسرے انسانوں کے بارے میں سوچتا ہے یا اپنے جیسے افراد کے ساتھ زندگی کی تگ ودو میں شریک ہوتا ہے تو اپنی سطح سے بلند نہیں ہو پاتا۔ اسی طرح، اشیاءِ کائنات— انسان سے رتبے اور حیثیت میں کم تر ہیں۔ اس لیے اُن کا استعمال انسان کو آسودگی تو عطا کرتا ہے مگر بلندی نہیں عطا کرتا۔ چنانچہ انسان کے فکر وعمل کی پرواز، اگر اُن روابط تک ہی محدود رہے، جو دوسرے انسانوں سے یا چیزوں سے قائم کیے جاسکتے ہوں، تو اُسے وہ عظمت و رفعت نہیں ملتی، جس کی طلب انسانی فطرت میں موجود ہوتی ہے۔ بلندی اور عظمت سے محروم — انسانی شخصیت— آفاقیت کی رمز شناس نہیں ہوسکتی۔ ایسا انسان، ماحول سے متاثر ہو جاتا ہے اور آسانی سے تعصب کا شکار ہو جاتا ہے۔ انسانی سرگرمیاں سطحی ہوں تو انسان کے شعور کو پختگی حاصل نہیں ہوتی۔

اپنی جولاں گاہ، زیرِ آسماں سمجھا تھا میں
آب و گِل کے کھیل کو اپنا جہاں، سمجھا تھا میں
بے حجابی سے تری ٹوٹا، نگاہوں کا طلسم
اِس ردائے نیل گوں کو آسماں سمجھا تھا میں

ربِ کائنات سے تعلق:

انسان کی شخصیت، بلندی، رفعت اور عظمت سے اُس وقت ہم کنار ہوتی ہے جب اُس کا تعلق ربِ کائنات سے قائم ہوتا ہے۔ اللہ کے قرب کے طلب گار انسان کی نگاہ وسیع ہوتی ہے اور اُس کا تصور آفاقی ہوتا ہے۔ اب یہ ظاہر ہے کہ خالقِ کائنات سے تعلق کی بنیاد صرف توحید ہوسکتی ہے۔ ملحد تو خالقِ کے وجود کا ہی قائل نہیں ہوتا چنانچہ اُس سے تعلق کیسے قائم کرسکتا ہے؟ رہے مشرک افراد تو وہ خدا کے وجود کے قائل ہوتے ہیں لیکن اُس کے ساتھ دوسروں کو بھی شریک کرتے ہیں چنانچہ محبت کے جذبات جو خدا کے لیے ہونے چاہئیں، ایسے جذبات وہ جھوٹے معبودوں کے لیے بھی اپنے دل میں رکھتے ہیں۔ اس لیے ملحدین اور مشرکین، دونوں کا طرزِ فکر اور طرزِ زندگی، انہیں آفاقیت سے بے گانہ کر دیتا ہے، اور عظمت و بلندی کے بجائے پستی اور کوتاہ بینی اُن کے حصے میں آتی ہے۔

يَعْلَمُونَ ظَاهِراً مِّنَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَهُمْ عَنِ الْآخِرَةِ هُمْ غَافِلُونَ ٥ (الروم:۷)

''یہ لوگ، دنیا کی زندگی کا بس ظاہری پہلو جانتے ہیں اور آخرت سے غافل ہیں۔''

سَأَلَ سَائِلٌ بِعَذَابٍ وَاقِعٍ (۱) لِّلْكَافِرِينَ لَيْسَ لَهُ دَافِعٌ (۲) مِّنَ اللَّهِ ذِي الْمَعَارِجِ (۳) تَعْرُجُ الْمَلَائِكَةُ وَالرُّوحُ إِلَيْهِ فِي يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهُ خَمْسِينَ أَلْفَ سَنَةٍ (۴) (المعارج:۴-۱)

''مانگنے والے نے عذاب مانگا ہے، (وہ عذاب) جو ضرور واقع ہونے والا ہے، کافروں کے لیے ہے۔ کوئی اُسے دفع کرنے والا نہیں، اُس خدا کی طرف سے ہے جو عروج کے زینوں کا مالک ہے۔''

أَوَ مَنْ كَانَ مَيْتاً فَأَحْيَيْنَاهُ وَجَعَلْنَا لَهُ نُوراً يَمْشِي بِهِ فِي النَّاسِ كَمَن مَّثَلُهُ فِي الظُّلُمَاتِ لَيْسَ بِخَارِجٍ مِّنْهَا كَذَلِكَ زُيِّنَ لِلْكَافِرِينَ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ٥ (الانعام:۱۲۲)

''کیا وہ شخص جو پہلے مردہ تھا پھر ہم نے اسے زندگی بخشی اور اُس کو وہ روشنی عطا کی جس کے اجالے میں وہ لوگوں کے درمیان زندگی کی راہ طے کرتا ہے، اُس شخص کی طرح ہوسکتا ہے جو تاریکیوں میں پڑا ہوا ہو اور کسی طرح اُن سے نہ نکلتا ہو۔؟''

إِنَّ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ وَكَانُوا شِيَعاً لَّسْتَ مِنْهُمْ فِي شَيْءٍ إِنَّمَا أَمْرُهُمْ إِلَى اللَّهِ ثُمَّ يُنَبِّئُهُم بِمَا كَانُوا يَفْعَلُونَ ٥ (الانعام:۱۵۹)

''جن لوگوں نے اپنے دین کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور گروہ، گروہ بن گئے، یقیناً اُن سے تمہارا کوئی واسطہ نہیں۔ ان کا معاملہ تو اللہ کے سپرد ہے، وہی اُن کو بتائے گا کہ انھوں نے کیا کچھ کیا ہے۔''

وَاتْلُ عَلَیْہِمْ نَبَأَ الَّذِیَ آتَیْنَاہُ آیَاتِنَا فَانسَلَخَ مِنْہَا فَأَتْبَعَہُ الشَّیْطَانُ فَکَانَ مِنَ الْغَاوِیْنَ o وَلَوْ شِئْنَا لَرَفَعْنَاہُ بِہَا وَلَـٰکِنَّہُ أَخْلَدَ إِلَی الأَرْضِ وَاتَّبَعَ ہَوَاہُ فَمَثَلُہُ کَمَثَلِ الْکَلْبِ إِن تَحْمِلْ عَلَیْہِ یَلْہَثْ أَوْ تَتْرُکْہُ یَلْہَث ذَّلِکَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِیْنَ کَذَّبُواْ بِآیَاتِنَا فَاقْصُصِ الْقَصَصَ لَعَلَّہُمْ یَتَفَکَّرُونَ o (اعراف: ۱۷۶-۱۷۵)

''ان کے سامنے اس شخص کا حال بیان کرو، جس کو ہم نے اپنی آیات کا علم عطا کیا تھا، مگر وہ اُن کی پابندی سے نکل بھاگا۔ آخر کار شیطان اُس کے پیچھے پڑ گیا، یہاں تک کہ وہ بھٹکنے والوں میں شامل ہو کر رہا۔ اگر ہم چاہتے تو اُسے ان آیتوں کے ذریعے بلندی عطا کرتے، مگر وہ تو زمین ہی کی طرف جھک کر رہ گیا اور اپنی خواہشِ نفس کے پیچھے پڑا رہا۔ لہٰذا اُس کی حالت، کتے کی سی ہوگئی کہ تم اس پر حملہ کرو تب بھی زبان لٹکائے رہے اور اُسے چھوڑ دو تب بھی زبان لٹکائے رہے۔ یہی مثال ہے اُن لوگوں کی جو ہماری آیات کو جھٹلاتے ہیں۔ تم یہ حکایات ان کو سناتے رہو، شاید کہ یہ کچھ غور وفکر کریں۔''

تعصب کا تدارک:

یہ بات واضح ہوچکی ہے کہ انسان کی کوتاہ بینی، تنگ نظری اور تنگ دلی اُس کو تعصب کی طرف مائل کرتی ہے۔ وہ اپنی اور کائنات کی حقیقت سے بے خبر ہوتا ہے چنانچہ اُس کی فکر ونظر محدود ہوتی ہے۔ ایسا شخص عظمتِ کردار کا طلب گار نہیں ہوتا بلکہ اپنی خواہشات کا بندہ بنا رہتا ہے۔ چنانچہ دوسرے انسانوں کے ساتھ انصاف، رحم اور فیاضی کا معاملہ کرنے کے بجائے، وہ محض اپنے مادی مفاد کو سامنے رکھتا ہے اور دنیوی فائدوں کے حصول کے لیے تمام اعلیٰ قدروں کو پامال کر دیتا ہے۔ ایسے شخص کی اصلاح کے لیے ضروری ہے کہ اُسے، اُس کے رب سے روشناس کرایا جائے، حقائق سے اُسے آگاہ کیا جائے اور رب کے سامنے حاضری کی یاد دہانی کی جائے۔ اگر وہ اپنے قلب و ذہن اور فکر و کردار میں صالحیت اختیار کرلے تو تعصب سے بچ سکتا ہے۔ قرآن نے اس سلسلے میں فرعون کی مثال دی ہے۔

فرعون نے اقتدار کے نشے میں چور ہو کر رب کائنات کی حاکمیت کا انکار کیا اور زمین میں فساد برپا کیا۔ اس نے تعصب کا رویہ اختیار کیا اور بنی اسرائیل کو اپنے ظلم وستم کا شکار بنایا۔ قرآن مجید نے اس کی روش کا تذکرہ کیا ہے:

إِنَّ فِرْعَوْنَ عَلَا فِیْ الْأَرْضِ وَجَعَلَ أَہْلَہَا شِیَعاً یَسْتَضْعِفُ طَائِفَۃً مِّنْہُمْ یُذَبِّحُ أَبْنَاء ہُمْ وَیَسْتَحْیِیْ نِسَاء ہُمْ إِنَّہُ کَانَ مِنَ الْمُفْسِدِیْنَ o (قصص: ۴)

''واقعہ یہ ہے کہ فرعون نے زمین میں سرکشی کی اور اُس کے باشندوں کو تقسیم کر دیا۔ اُن میں سے ایک گروہ کو وہ ذلیل کرتا تھا، اُس کے لڑکوں کو قتل کرتا اور اُس کی لڑکیوں کو زندہ رہنے دیتا تھا۔ فی الواقع وہ مفسد لوگوں میں سے تھا۔''

چنانچہ موسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے ہدایت کی کہ فرعون کی اصلاح کی کوشش کریں۔ اصلاح کی بنیاد کی بھی اللہ نے نشان دہی کی یعنی ''رب کی طرف رجوع اور دل کو اُس کے خوف سے معمور کرنا۔'' قرآن مجید کا ارشاد ہے:

انسان کے فکر و عمل کی پرواز، اگر اُن روابط تک ہی محدود رہے، جو دوسرے انسانوں سے یا چیزوں سے قائم کیے جاسکتے ہوں، تو اُسے وہ عظمت و رفعت نہیں ملتی، جس کی طلب انسانی فطرت میں موجود ہوتی ہے۔ بلندی اور عظمت سے محروم انسانی شخصیت ـــ آفاقیت کی رمز شناس نہیں ہوسکتی۔ ایسا انسان، ماحول سے متاثر ہو جاتا ہے اور آسانی سے تعصب کا شکار ہو جاتا ہے۔ انسانی سرگرمیاں سطحی ہوں تو انسان کے شعور کو پختگی حاصل نہیں ہوتی۔

ہَلْ أتَاکَ حَدِیْثُ مُوسَی o إِذْ نَادَاہُ رَبُّہُ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًی o اذْہَبْ إِلَی فِرْعَوْنَ إِنَّہُ طَغَی o فَقُلْ ہَل لَّکَ إِلَی أَن تَزَکَّی o وَأَہْدِیَکَ إِلَی رَبِّکَ فَتَخْشَی o (نازعات: ۱۹-۱۵)

''کیا تمہیں موسیٰ کے قصے کی خبر پہنچی ہے؟ جب اُس کے رب نے اسے طوٰی کی مقدس وادی میں پکارا تھا کہ ''فرعون کے پاس جاؤ، وہ سرکش ہوگیا ہے اور اس سے کہو کہ کیا تو اس کے لیے تیار ہے کہ پاکیزگی اختیار کرے اور میں تیرے رب کی طرف تیری رہنمائی کروں تو (اُس کا) خوف تیرے اندر پیدا ہو؟''

لیکن جیسا کہ معلوم ہے فرعون نے موسیٰ علیہ السلام کی نصیحت سے فائدہ نہیں اٹھایا بلکہ اپنی گمراہی، تکبر اور تعصب پر قائم رہا، چنانچہ اللہ کی سزا کا شکار ہوا۔

فَأَرَاہُ الْآیَۃَ الْکُبْرَی o فَکَذَّبَ وَعَصَی o ثُمَّ أَدْبَرَ یَسْعَی o فَحَشَرَ فَنَادَی o فَقَالَ أَنَا رَبُّکُمُ الْأَعْلَی o فَأَخَذَہُ اللَّہُ نَکَالَ الْآخِرَۃِ وَالْأُولَی o إِنَّ فِیْ ذَلِکَ لَعِبْرَۃً لِّمَن یَخْشَی o (نازعات: ۲۶-۲۰)

''پھر موسیٰ نے فرعون کو (اللہ کی عطا کردہ) بڑی نشانی دکھائی۔ مگر فرعون نے جھٹلا دیا اور نہ مانا۔ پھر وہ چالبازیاں کرنے کے لیے پلٹا اور لوگوں کو جمع کر کے اُس نے پکار کر کہا کہ ''میں تمہارا سب سے بڑا رب ہوں''۔ آخر کار اللہ نے اُسے آخرت اور دنیا کے عذاب میں پکڑ لیا۔ درحقیقت اس میں بڑی عبرت ہے، ہر اُس شخص کے لیے جو ڈرے۔''

وَاسۡتَكۡبَرَ هُوَ وَجُنُودُهُ فِيۡ الۡأَرۡضِ بِغَيۡرِ الۡحَقِّ وَظَنُّوا أَنَّهُمۡ إِلَيۡنَا لَا يُرۡجَعُونَ ٥ فَأَخَذۡنَاهُ وَجُنُودَهُ فَنَبَذۡنَاهُمۡ فِيۡ الۡيَمِّ فَانظُرۡ كَيۡفَ كَانَ عَاقِبَةُ الظَّالِمِيۡن ٥ (قصص: ۴۰-۳۹)

''فرعون اور اُس کے لشکروں نے زمین میں بغیر کسی حق کے اپنی بڑائی کا گھمنڈ کیا اور سمجھے کہ انھیں کبھی ہماری طرف پلٹنا نہیں ہے۔ آخرکار، ہم نے اس کو اور اس کے لشکروں کو پکڑا اور سمندر میں پھینک دیا۔ اب دیکھ لو کہ ان ظالموں کا کیسا انجام ہوا۔''

عمرانی تناظر:

حیات وکائنات کی حقیقت سے بے خبری، تعصب کی طرف انسان کو لے جاتی ہے۔ اس بنیادی سبب کے علاوہ، تعصب کا عمرانی تناظر بھی قابل توجہ ہے۔ جب انسان، وحدتِ بنی آدم کو فراموش کر دیتا ہے تو وہ تعصب کا شکار ہوجاتا ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ قبیلہ، نسل، رنگ اور علاقے کے تمام اختلافات کے باوجود، سارے انسان، ایک ہی انسانی جوڑے (آدم وحوا) کی اولاد ہیں، چنانچہ سب ایک عالم گیر برادری سے تعلق رکھتے ہیں۔ اُن کے درمیان، رنگ ونسل کے فرق کی وجہ سے تعصب برتنا، بے خبری کی علامت ہے۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقۡنَاكُم مِّن ذَكَرٍ وَأُنثَى وَجَعَلۡنَاكُمۡ شُعُوباً وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا إِنَّ أَكۡرَمَكُمۡ عِندَ اللّٰهِ أَتۡقَاكُمۡ إِنَّ اللّٰهَ عَلِيمٌ خَبِيرٌ ٥ (حجرات: ۱۳)

''اے انسانو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور پھر تمہاری قومیں اور برادریاں بنادیں تا کہ تم ایک دوسرے کو پہچانو۔ درحقیقت، اللہ کے نزدیک، تم میں سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو تمہارے اندر سب سے زیادہ پرہیزگار ہے۔ یقیناً اللہ، سب کچھ جاننے والا اور باخبر ہے۔''

سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ، اس آیت کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اس آیت میں پوری نوعِ انسانی کو خطاب کر کے اُس عظیم گمراہی کی اصلاح کی گئی ہے جو دنیا میں ہمیشہ عالم گیر فساد کی موجب بنی رہی ہے، یعنی نسل، رنگ، زبان، وطن اور قومیت کا تعصب۔ اس مختصر سی آیت میں اللہ تعالیٰ نے تمام انسانوں کو مخاطب کر کے تین نہایت اہم اصولی حقیقتیں بیان فرمائی ہیں۔

ایک یہ کہ تم سب (انسانوں) کی اصل ایک ہی ہے، ایک ہی مرد اور ایک ہی عورت سے تمہاری پوری نوع وجود میں آئی ہے۔ اور آج تمہاری جتنی نسلیں (Races) بھی دنیا میں پائی جاتی ہیں وہ درحقیقت ایک ابتدائی نسل کی شاخیں ہیں جو ایک ماں اور ایک باپ سے شروع ہوئی تھی۔

دوسرے یہ کہ اپنی اصل کے اعتبار سے ایک ہونے کے باوجود تمہارا قوموں اور قبیلوں میں تقسیم ہوجانا، ایک فطری امر تھا۔ مگر اس فطری فرق واختلاف کا تقاضا، یہ ہرگز نہ تھا کہ اس کی بنیاد پر اونچ اور نیچ، شریف اور کمین، برتر اور کم تر کے امتیازات قائم کیے جائیں، ایک نسل دوسری نسل پر اپنی فضیلت جتائے، ایک رنگ کے لوگ، دوسرے رنگ کے لوگوں کو ذلیل وحقیر جانیں اور ایک قوم، دوسری قوم پر اپنا تفوق جمائے۔ خالق نے جس وجہ سے انسانی گروہوں کو اقوام اور قبائل کی شکل میں مرتب کیا تھا وہ صرف یہ تھی کہ اُن کے درمیان باہمی تعاون اور تعارف کی فطری صورت یہی تھی۔

تیسرے یہ کہ انسان اور انسان کے درمیان، فضیلت اور برتری کی بنیاد اگر کوئی ہے اور ہوسکتی ہے تو وہ صرف اخلاقی فضیلت ہے۔'' (ترجمہ قرآن مجید مع مختصر حواشی)

تاریخ گواہ ہے کہ اسلام کی مندرجہ بالا تعلیم تعصب دور کرسکتی ہے۔ دورِ اول میں مختلف قبائل اور نسلوں کے لوگوں نے ایمان لاکر امتِ مسلمہ میں شمولیت اختیار کی۔ انھوں نے اپنی متنوع صلاحیتوں کو استعمال کر کے اللہ کے دین کو دنیا میں پھیلایا۔ ان کی سرگرمیاں اور کاوشیں، زمین کے کسی ایک خطے تک محدود نہ تھیں بلکہ وہ ساری متمدن دنیا میں پھیل گئے۔ اسلام کے وسیع دامن میں ہر رنگ، نسل اور علاقے کے لوگ یکساں حقوق واختیارات کے ساتھ شامل ہوئے، اُن سب کو انسانیت کی خدمت کرنے کا اور اپنی صلاحیتوں کے ارتقا کا یکساں موقع حاصل تھا۔ توحید کے ساتھ عدل، مساوات اور تکریمِ انسانیت کی قدریں، اسلام کی پہچان قرار پائیں۔ آج کے مسلمان بھی اگر اپنی فکر ونظر کو ازسرِ نو آفاقی بنالیں تو دنیا اُن کی رہنمائی سے فیض یاب ہوسکتی ہے اور تعصب سماج سے مٹ سکتا ہے۔

یہی مقصودِ فطرت ہے، یہی رمزِ مسلمانی
اخوت کی جہاں گیری، محبت کی فراوانی
بتانِ رنگ وخوں کو توڑ کر ملت میں گم ہوجا
نہ تورانی رہے باقی، نہ ایرانی نہ افغانی
مٹایا قیصر و کسریٰ کے استبداد کو جس نے
وہ کیا تھا! زورِ حیدر، فقرِ بوذر، صدقِ سلمانی

حقائق کی اس یاددہانی کے بعد، اقبال نے اُس راہِ عمل کی نشاندہی کی ہے جسے مسلمانوں کو اختیار کرنا چاہیے:

تو رازِ کُن فکاں ہے اپنی آنکھوں پر عیاں ہوجا
خودی کا راز داں ہوجا، خدا کا ترجماں ہوجا
ہوس نے کردیا ہے ٹکڑے ٹکڑے نوعِ انساں کو
اخوت کا بیاں ہوجا، محبت کی زباں ہوجا
یہ ہندی، وہ خراسانی، یہ افغانی وہ تورانی
تو اے شرمندہ ساحل، اچھل کر بے کراں ہوجا
غبار آلودہ رنگ و نسب ہیں بال و پر تیرے
تو اے مرغِ حرم، اُڑنے سے پہلے پر فشاں ہوجا
ترے علم و محبت کی نہیں ہے انتہا کوئی
نہیں ہے تجھ سے بڑھ کر سازِ فطرت میں نوا کوئی

عصبیت زدہ معاشرہ
اور میڈیا کا مطلوبہ کردار

عمیر کوٹی ندوی

عصبیت کی حقیقت اور بنیادی اسباب

اپنی فہم، سوچ وسمجھ کو متاع کل سمجھنے، اسی سمجھ کے ترازو میں دنیا کے تمام معاملات کو تولنے، اسی پہلو سے ان کا جائزہ لینے اور پھر صحیح وغلط اور حق وناحق کے مابین تمیز کئے بغیر اس سے حاصل شدہ نتیجہ پر پوری شدت، اشتعال انگیزی اور جذباتیت کے ساتھ جم جانے کا نام عصبیت وتعصب ہے۔ اس کا مارا ہوا آدمی آنکھوں پر پٹی باندھ لیتا ہے۔ وہ حق وصداقت کا پیروکار نہیں ہوتا بلکہ من وتو کے اصول پر عمل پیرا ہوکر بے جا حمایت وطرفداری کرنے کی راہ پر چل پڑتا ہے۔ اس کی انا اسے خودسری، نام ونمود اور سربراہی کی خوگری کے لئے ابھارتی ہے۔ لہذا وہ اس سے مغلوب ہوکر اپنی سوچ وسمجھ، نظریہ وافکار، طرز حیات سے عدم اتفاق کرنے والے کو برداشت نہیں کرپاتا ہے۔ اس کو رد کرنے اور مقابلہ آرائی کرنے پر آمادہ ہوجاتا ہے۔ اس کام میں وہ پوری شدت کے ساتھ لگتا ہے اور تمام ممکنہ وسائل وذرائع کو بھی استعمال کرتا ہے۔ اس کے لئے اگر اسے گروہ بندی اور دھڑے بندی کی ضرورت پیش آتی ہے تو وہ اس سے بھی گریز نہیں کرتا ہے اور جذبہ عصبیت سے مغلوب ہوکر ظلم کا ساتھ دینے والے ہم خیال لوگوں کو اپنے اردگرد جمع کرلیتا ہے۔ پھر یہ سب جماعت، پارٹی، تنظیم اور ادارے کی شکل میں اپنی فکر پر جمود، اس کی ترویج اور اس سے اختلاف کرنے والوں کو صفحۂ ہستی سے مٹادینے کے کام پر لگ جاتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ یہ لوگ انسانوں کو ان کے خالق کی طرف سے عطا کی گئی عقل سلیم، فطرت، شعور عام اور ضمیر کو نہ کام پر لاتے ہیں اور نہ حقیقی روحانی کیفیات کو ہی حاصل کرپاتے ہیں۔ جب حق ان پر دلائل کے ساتھ ظاہر اور واضح ہوجاتا ہے تو بھی وہ اسے قبول نہیں کرتے ہیں بلکہ فطرت کے خلاف عمل پیرا ہوکر کھلی ہوئی حیوانیت پر اتر آتے ہیں۔

عصبیت کا ھدف

عدل وقسط اور حق کو قبول نہ کرنے کی حد تک بڑھی ہوئی انانیت، اشتعال انگیزی اور جذباتیت کو احادیث مبارکہ میں "عصبیہ" کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ عصبیت کا عقل، درست فیصلے اور شعور کے ساتھ کسی قسم کا تعلق نہیں ہے۔ عصبیت کے نتیجہ میں ایک ایسا ذہن تیار ہوتا ہے جو دوسروں کا لحاظ کئے اور ان کی بات سنے بغیر منفی باتوں پر بضد رہنے، ہٹ دھرمی کا مظاہرہ کرنے اور ہر معاملے میں صرف اپنی ذات اور رائے کو سب سے برتر سمجھنے، دوسروں کو اپنی رائے کو تسلیم کرنے کے لئے مجبور کرنے، نہ ماننے کی صورت میں انہیں برا بھلا کہنے، ان کے خلاف ماحول تیار کرنے، ان پر ظلم کرنے اور ان کو ایذائیں پہنچانے کا کام کرتا ہے۔ یہ کام آغاز انسانیت سے لے کر اس وقت تک ہر دور اور ہر زمانہ میں ہوا ہے۔ عہد رسالت میں مشرکین، منافقین اور اہل کتاب نے اسلام اور مسلمانوں کے خلاف عصبیت کا مظاہرہ کیا ہے۔ عصبیت نے اسلام کے چشمہ صافی کو بغض کے خاروخس سے مکدر کرنے کی ہر کوشش کو انجام دیا ہے۔ اس نے ہر نفس کو گمراہ کرنے، حق سے لوگوں کو دور رکھنے اور ہر سو آگ کو بھڑکانے کی انتھک کوشش کی ہے۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ اہل حق نے انسانی عقل وشعور کی اس کج فہمی کو ٹھکرایا ہے اور ان سے کوئی لاگ لپیٹ نہیں رکھی اس لئے کہ خالق کائنات نے ان سے ایسے لوگوں کو دوست نہ بنانے، ان پر بھروسہ نہ کرنے اور ان سے فکری ونظریاتی ہم آہنگی پیدا نہ کرنے کی تاکید کی ہے۔

چونکہ میڈیا کے لئے دولت بھی درکار ہوتی ہے اس لئے اس نے اپنی سیاسی وابستگی دوسروں سے قائم کر رکھی تھی، لیکن کمال ہوشیاری سے ایک عرصہ سے یہ اپنی ان تینوں صفات میں توازن بھی برقرار رکھے ہوئے تھا اس لئے اس کا کردار بے نقاب نہیں ہوا تھا۔ اسی توازن اور سیاسی وابستگی کی وجہ سے اس کے سیکولر ہونے کا بھرم بھی قائم تھا۔

عصبیت کے مظاہر

اہل حق کا یہ طرز عمل آج بھی اہل تعصب کو پھوٹی آنکھ نہیں بھا رہا ہے۔ اس وقت سماج کا ایک طبقہ آنکھوں پر پٹی باندھ کر تعصّبات، اشتعال انگیزی، جذباتیت، بے جا حمایت و طرفداری، ضد، ہٹ دھرمی اور امتیاز من وتو کا شکار ہوکر ایک مخصوص سوچ وسمجھ، نظریہ وافکار اور طرز حیات سے عدم اتفاق کرنے والے کو برداشت نہ کر پانے کی روش پر گامزن ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ زندگی کے تمام شعبے اور انسانوں کے تمام طبقات اس کی فکر ونظریہ اور اس کو پسند طرز حیات کے طابع ومطیع بن جائیں۔ تب ہی وسائل حیات اور آرائش زندگی میں ان کا حق تسلیم کیا جائے گا۔ اور جو لوگ اس کے لئے آمادہ نہ ہوں وہ چاہتا ہے کہ ان کا وجود ہی اس دنیا سے ختم ہو جائے سوائے ان کے جو محض دو دن کی زندگی اور دنیاوی عیش وآرام کی خاطر ذلت وخواری کو اپنا مقدر ماننے کے لئے تیار ہوں۔ عصبیت کی بنیاد پر تشکیل دیے جانے والے یا اس طرح کی کوششوں کا سامنا کرنے والے اس سماج میں عصبیت کے متعدد مظاہر ملتے ہیں۔ خود اس قسم کی عصبیت کے داعی طبقہ کے درمیان بھی بالادست اور زیردست کی واضح تصویر نظر آتی ہے۔ اس کی داخلی دنیا ظلم وجور، بہیمیت وحیوانیت سے عبارت ہے۔ وہاں ایک بڑی آبادی کو محقور ومجبور بنا دیا گیا ہے۔ عصبیت کا دل آج بھی انہیں آسانی سے انسان تک تصور کرنے کے لئے تیار نہیں ہے۔ ذلت وخواری اور ظلم وبربریت کے مناظر آئے دن گاؤں دیہاتوں اور قصبات وشہروں کی سڑکوں، گلی، کوچوں میں نظر آتے رہتے ہیں اور دل کو دہلا دینے والی داستانیں سنائی دیتی رہتی ہیں۔ گاہے گاہے اس تعلق سے کبھی کبھار کچھ باتیں پرنٹ میڈیا، الیکٹرانک میڈیا اور سوشل میڈیا میں بھی آجاتی ہیں۔ وہ بھی اس وقت جب واقعہ منظر عام پر آچکا ہو، لوگ اس کی طرف متوجہ ہو رہے ہوں اور اس کا دبانا ممکن نہ ہو بصورت دیگر اس سے اسے ٹی آر پی مل رہی ہو۔

سماج میں میڈیا کا کردار

عام حالات میں ہمارے سماج میں میڈیا کا کیا کردار ہے یا اس نے اپنے لئے جان بوجھ کر کس کردار کو چن لیا ہے، اسے کون نہیں جانتا۔ یہ بات کسی سے ڈھکی چھپی نہیں رہی کہ ہمارے سماج کا میڈیا عموماً عصبیت زدہ، مفاد پرست اور موقع شناس ہے۔ مین اسٹریم میڈیا ہو کہ لوکل میڈیا اس کے بڑے طبقہ کی فکری وابستگی عرصہ دراز سے عصبیت کے ساتھ ہی رہی ہے۔ چونکہ میڈیا کے لئے دولت بھی درکار ہوتی ہے اس لئے اس نے اپنی سیاسی وابستگی دوسروں سے قائم کر رکھی تھی، لیکن کمال ہوشیاری سے ایک عرصہ سے یہ اپنی ان تینوں صفات میں توازن بھی برقرار رکھے ہوئے تھا اس لئے اس کا کردار بے نقاب نہیں ہوا تھا۔ اسی توازن اور سیاسی وابستگی کی وجہ سے اس کے سیکولر ہونے کا بھرم بھی قائم تھا۔ لیکن جیسے ہی اس کی موقع شناس صفت وفطرت نے یہ دیکھا کہ اب عصبیت دولت کی فراہمی پر قادر ہو چکی ہے اور عملاً اس نے اس کی ضرورتوں کو پورا کرنا شروع بھی کر دیا ہے تو اس نے اس سے اپنی سیاسی وابستگی بھی قائم کرنے میں لمحہ بھر کی بھی تاخیر نہیں کی۔ اس کا نتیجہ سب کے سامنے ہے کہ کل خود کو سیکولر کہنے والا میڈیا عصبیت کا دست وبازو بن گیا ہے۔ جس نے ایسا کرنے سے انکار کیا اسے مجبور کیا گیا اور جو اس پر بھی آمادہ نہ ہوا اسے سرعام رسوا وپریشان کیا گیا۔ یہ سلسلہ بدستور جاری ہے اس لئے کہ یہی عصبیت کا طریقہ ہے۔ اس کے شواہد ونظائر کو ڈھونڈھنے اور سمجھنے کے لئے بہت غور وفکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس لئے کہ عصبیت کے خوگروں اور عصبیت زدہ کے علاوہ پورے سماج کو یہ سب کچھ کھلی آنکھوں نظر آ رہا ہے۔

میڈیا سے توقعات کی حقیقت

اس کردار کا حامل میڈیا افراد کی ذہن سازی میں اپنا کردار ادا کر رہا ہے اور بہت ہی مؤثر انداز سے کر رہا ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ اس نے انتہائی کم وقت میں سماج کی ترجیحات، موضوعات، مزاج، کردار اور اخلاقیات کو بدل کر رکھ دیا ہے۔ اس مدت کے دوران اس نے منفی بنیادوں اور خطوط پر منفی انداز سے افراد کی ذہن سازی کا کام کیا ہے۔ اس میں اسے یک گونہ کامیابی بھی ملی ہے اور اس کا اسے پھل بھی ملا ہے۔ ایسی صورت میں اس سے کسی مثبت کردار کی توقع کرنا اور وہ بھی اس قیمت پر جو مادی، سیاسی بنیادوں پر بے قیمت ہو خلاف واقعہ بات ہوگی۔ یہ سراب میں پانی، جھاگ میں زندگی اور تانبہ وپیتل میں سونا تلاش کرنے سے بھی زیادہ بے حقیقت اور بے سود بات ہوگی۔ ایک ایسا میڈیا جس کا عصبیت ایمان ویقین ہو، جس کے قیام، انتظام وانصرام میں کلی طور پر ان لوگوں کا ہاتھ ہو جو مفاد پرستی اور موقع شناسی پر ایمان رکھتے ہوں اور دولت ہی ان کی زندگی کا کل حاصل ہو، وہ کیسے مثبت خطوط پر افراد کی ذہن سازی اور اعلیٰ کردار کے لئے خود کو دار پر چڑھانے کے لئے تیار ہو جائے گا۔ ہمارے سماج کی ایک تصویر یہ بھی ہے کہ یہاں ظلم وجور کے خوگروں، ناانصافیوں کے دلدادوں، دادعیش دینے والوں سے جود وسخا کی توقع ہی نہیں پائی جاتی ہے بلکہ ان سے فریاد بھی کی جاتی ہے۔

بقول اختر شیرانی:

قسمت کا ستم ہی کم نہیں کچھ یہ تازہ ستم ایجاد نہ کر!

یوں ظلم نہ کر، بیدار نہ کر!اے عشق ہمیں برباد نہ کر!

اس فریاد اور آہ وفغاں سے حاصل تو کچھ نہیں ہوتا ہاں عصبیت کو توانائی ضرور ملتی ہے اور وہ نئے جوش اور حوصلے سے اپنی فکر پر جمود، اس کی ترویج اور اس سے اختلاف کرنے والوں کو صفحہ ہستی سے مٹا دینے کے کام کی سمت ایک قدم اور آگے بڑھا دیتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جود وسخا کی توقع نے عصبیت زدہ، مفاد پرست اور موقع شناس میڈیا کے اشتراک سے اہل حق کی ایک بڑی تعداد کو بھی اس حد تک متاثر کر دیا ہے کہ اس نے دو دن کی زندگی اور دنیاوی عیش و آرام کو پیش نظر رکھتے ہوئے عصبیت کے داعیوں، ظلم وجور کے خوگروں کو اپنا دوست بنالیا ہے، ان پر بھروسہ کر بیٹھی ہے اور ان سے فکری ونظریاتی ہم آہنگی پیدا کر چکی ہے۔ اس کے باوجود عصبیت اپنے عمل و کردار پر بہ دستور قائم ہے۔ اس نے خودسری اور سر براہی کی خوگری کے نشہ میں چور ہو کر اشتعال انگیزی اور جذباتیت کا سہارا لے کر نہ صرف ملک کے شہریوں کی جان ومال، عزت وآبرو کو پامال کیا بلکہ یہاں کے اقدار، افکار، نظریات اور تہذیب وثقافت پر فرقہ پرستی کے تیر ونشتر چلائے اور انسانیت پر مبنی ملک کے سماجی تانے بانے کو تار تار کر دیا۔ اس نے ملک کے دیگر وسائل وذرائع کے ساتھ ساتھ میڈیا کو بھی اسی کام پر لگا دیا۔ اس وقت سے آج تک عصبیت زدہ، مفاد پرست اور موقع شناس میڈیا اسی کام پر لگا ہوا ہے۔ عصبیت کے اشارے پر اشتعال انگیزی، جذباتیت، من وتو کے اصول پر عمل پیرا ہو کر جانب داری، بے جا حمایت وطرفداری کرنے کی راہ پر نہ صرف چل رہا ہے بلکہ وہ حقائق کو توڑنے مروڑنے، ناپسندیدہ طبقات پر الزام تراشیاں کرنے، ان کے خلاف پروپیگنڈا کرنے اور ظلم وجور کا ماحول تیار کرنے سے بھی دریغ نہیں کرتا۔ اس کے نتیجہ میں اس مدت میں منفی بنیادوں اور خطوط پر منفی انداز سے افراد کی ذہن سازی کا جو کام اس نے انجام دیا ہے اور اس کے نتیجہ میں جو ذہن تیار ہوا اس نے وہ کارنامے انجام دئے ہیں جنہیں دیکھ کر انسانیت انگشت بہ دنداں ہے۔ اس کے یہ کارنامے ڈھکے چھپے نہیں بلکہ سب کے سامنے ہیں۔

> عصبیت کے اشارے پر اشتعال انگیزی، جذباتیت، من وتو کے اصول پر عمل پیرا ہو کر جانب داری، بے جا حمایت وطرفداری کرنے کی راہ پر میڈیا نہ صرف چل رہا ہے بلکہ وہ حقائق کو توڑنے مروڑنے، ناپسندیدہ طبقات پر الزام تراشیاں کرنے، ان کے خلاف پروپیگنڈا کرنے اور ظلم وجور کا ماحول تیار کرنے سے بھی دریغ نہیں کرتا۔

میڈیا کا مثبت، مؤثر اور مطلوبہ کردار

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ میڈیا کے مثبت، مؤثر اور مطلوبہ کردار کے خاتمہ اور اس کے موجودہ کردار کی تشکیل میں جس نے نمایاں اور اہم کردار ادا کیا ہے وہ ہے عصبیت۔ اسی کے ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ ہمارے سماج میں عصبیت زدہ، مفاد پرست اور موقع شناس میڈیا کے ساتھ ساتھ عصبیت سے کم درجہ متاثر میڈیا کا ایک طبقہ بھی موجود ہے۔ اس کی طرف سے کچھ باتیں کبھی کبھی سامنے آجاتی ہیں یا وہ مصلحتاً توازن قائم رکھنے کے لئے کچھ چیزیں پیش کر دیتا ہے۔ اسی طرح اس ذہنیت کے خلاف بھی میڈیا کا ایک طبقہ موجود ہے لیکن ایک دو کو چھوڑ کر زیادہ تر صحافت کے میدان میں حاشیہ پر ہیں۔ جہاں تک طبقاتی، فرقہ واری، گروہی، علاقائی، لسانی اقلیتی میڈیا کا تعلق ہے تو اس کی آواز "کون سنتا ہے نقار خانہ میں طوطی کی آواز" کے مصداق صدا بہ صحرا سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی۔ اس لئے اس میں اٹھنے والی آواز سے فوری اور بڑے پیمانے پر اثرات کے مرتب ہونے یا نتائج کے برآمد ہونے کی امید نہیں کی جاسکتی۔ ہاں یہ بات ضرور ہے کہ میڈیا کے اس طبقہ میں وہ فکر مل جاتی ہے جو مثبت بھی ہوتی ہے اور تعمیری بھی۔ یہاں افراد کی ذہن سازی کی وہ فکر بھی مل جاتی ہے جس نے ماضی میں ذہن سازی کا بڑے پیمانے پر کام کیا ہے، وہ ملک وعوام اور قوم وملت کی آرزوؤں، تمناؤں اور توقعات پر صد فیصد کھری اتری ہے اور بیڑے کو بھی پار لگاتی رہی ہے۔ ہمارے ملک کی آزادی میں اس کا بڑا اور مؤثر حصہ رہا ہے۔ لیکن حصول آزادی کے فوراً بعد ہی دھماکہ خیز حالات کے نتیجہ میں ملک کے اسٹریم میڈیا پر منفی کردار غالب آگیا۔ اس کے باوجود مین اسٹریم میڈیا کا ایک محدود طبقہ ہو کہ مذکورہ طبقاتی، فرقہ واری، گروہی، علاقائی، لسانی اقلیتی میڈیا، میڈیا سے وابستہ افراد ہوں کہ سوشل میڈیا میں دلچسپی رکھنے والے سرگرم افراد، میڈیا سے مثبت کردار کلی طور پر ختم نہیں ہوا ہے۔ اگر ان کی باتوں کو تسلسل کے ساتھ سنا اور تحریروں کو پڑھا جائے، ان تک رسائی حاصل کی جائے، انہیں منظم کرنے، ان کے افکار وخیالات کی ترویج وترسیل اور ضروری وسائل وذرائع کو بروئے کار لانے اور بہم پہونچانے کی کوشش کی جائے اور یہ عمل مین اسٹریم میڈیا میں مؤثر اور بااختیار جگہ بنانے کے ساتھ ساتھ ہو تو نہ صرف عصبیت وتعصب کی روک تھام میں میڈیا کے کردار کو مثبت اور مؤثر بنایا جاسکتا ہے بلکہ اس کی آواز کو بلند سے بلند تر کیا جاسکتا ہے اور اس کے ذریعہ سے ایک انسان دوست، صحت مند معاشرہ بھی تشکیل دیا جاسکتا ہے۔

متعصب سماج میں دعوت حق کا فریضہ

ابوسعداعظمی

امت مسلمہ داعی امت ہے،اس کا نصب العین بالکل واضح ہے۔قرآن کریم نے اسے خیر امت کے لقب سے سرفراز کیا ہے۔اس کا مقصد ہی لوگوں کو ہدایت ورہنمائی فراہم کرنا ہے،امر بالمعروف اورنہی عن المنکراس کے مشن کا اٹوٹ حصہ ہے۔اس کے اندر ایک ایسے گروہ کا پایا جانا انتہائی ضروری ہے جواسی کام کے لئے وقف ہو،خیر کی دعوت دے،بھلائی کا حکم کرے،برائی سے روکے یہ قرآن کریم کا مطالبہ ہے۔قرآن کریم نے اس کا طریق کار بھی متعین کردیا ہے کہ دین کی دعوت اورفریضۂ حق کی ادائیگی میں حکمت کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔گردوپیش سے واقفیت،حالات کا صحیح فہم اور ماحول کی نزاکت کا احساس ہوتا کہ حکمت وموعظت کے ذریعہ اس ذمہ داری کوصحیح طور پرادا کیا جاسکے۔انبیاء کرام کی سیرت کا جائزہ لینے سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے دعوت حق کے فریضہ کی ادائیگی میں اس حکمت کو خاص طور پر ملحوظ رکھا ہے اوراس راہ میں جن مسائل سے انہیں دوچار ہونا پڑاخندہ پیشانی کے ساتھ انہوں نے اس کا سامنا کیا ہے لیکن کبھی انہوں نے فریضہ حق کی ادائیگی میں کوتاہی نہیں کی۔

ہندوستان ہمیشہ سے مختلف مذاہب کی آماجگاہ رہا ہے،بہت ساری تہذیبیں یہاں پروان چڑھیں اورفنا ہوگئیں۔مذاہب سے عقیدت اوراس سے جذباتی وابستگی باشندگان ہند کے خمیر میں شامل ہے۔مذاہب کے نام پر عرصہ دراز تک ان کا استحصال بھی ہوتا رہا جس کی ایک طویل تاریخ ہے۔مسلمانوں کی آمد نے ہندوستان کا نقشہ ہی بدل دیا۔انہوں نے عدل وانصاف کی دعوت دی،اخوت کا درس دیا اورانسانی مساوات کا نعرہ بلند کیا۔دیکھتے ہی دیکھتے بلاد ہند کے طول وعرض میں مسلمانوں کا اثر ورسوخ بڑھتا گیا اورلوگ جوق درجوق آغوش اسلام میں پناہ لینے لگے۔پھرحالات نے کروٹ بدلی،انگریز ہندستان میں آئے اوراپنے سیاسی استحکام کے لئے انہوں نے ہندومسلم اتحاد میں دراڑیں پیدا کرنی شروع کیں۔رفتہ رفتہ ان کے سیاسی اثرونفوذ میں اضافہ ہوتا رہا اورایک وقت وہ بھی آیا جب وہ ملک کے طول وعرض پرقابض ہوگئے۔آزادی کی تحریک شروع ہوئی اوربے شمار قربانیاں اورلاتعداد افراد کی جانوں کا نذرانہ پیش کرکے ہندستان کوآزادی نصیب ہوئی لیکن انگریز ہندومسلم اتحاد کو پارہ پارہ کرنے میں کامیاب ہوگئے اوران کے درمیان نفرت وعداوت کا ایسا بیج لگادیا جس کی شاخیں اب تک بارآور ہیں۔اس پس منظر کی طویل تاریخ ہے جس کی یہاں گنجائش نہیں۔

ماضی قریب میں ہندوستان کے حالات نے جس تیزی سے تبدیل ہوئے ہیں اورمختلف سطح پرتعصب کوجس طرح فروغ حاصل ہوا ہے اس نے دعوت حق کی راہ میں پہلے سے کہیں زیادہ مسائل کھڑے کردیے ہیں اورہمیں اس بات پر سوچنے کے لئے مجبور کردیا ہے کہ اس متعصب سماج میں دعوت حق کا فریضہ کیسے ادا کیا جائے۔اگرچہ متعدد ایسی مسلم جماعتیں ہیں جواپنی سطح پردعوت حق کا فریضہ ادا کررہی ہیں اوراس کے خاطر خواہ نتائج بھی ہمارے سامنے ہیں۔لیکن نوجوان اورطلبہ اس سلسلہ میں خوف واندیشہ کی جس عجب کیفیت سے دوچار ہیں وہ ہمارے سامنے بالکل واضح ہے اورملک کے حالات پرجن افراد کی گہری نظر ہے ان کے نزدیک نوجوانان ہند کے یہ اندیشے بجا بھی ہیں۔اس تناظر میں اس موضوع کی اہمیت اور بڑھ جاتی ہے کہ آج کے اس متعصب سماج میں دعوت حق کی ادائیگی کا صحیح طریقہ کیا ہو۔

قرآنی آیات کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ جوافراد اس عظیم مشن کے لئے کھڑے ہوں ان کے اندر چند صفات کا پایا جانا انتہائی ضروری ہے:

(۱) اللہ تعالی پرغیر متزلزل یقین
(۲) آخرت کا صحیح تصور
(۳) صبرواستقامت
(۴) نصب العین کا صحیح شعوراورعملی زندگی میں اس کی ہم آہنگی

اسی طرح قرآن کریم سے یہ بھی واضح ہے کہ دعوت کی راہ کبھی بھی آسان نہیں رہی ہے۔انبیاء کی تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ یہ ایک خارزار وادی ہے،اس میں مصائب ومشکلات کے انبار ہیں،ابتلاء وآزمائش کا لامحدود سمندر ہے،جان ومال کا زیاں ہے۔لیکن اگرنصب العین کا صحیح شعور اوراس سے حقیقی وابستگی ہوتو اس راہ کی مشکلات بھی پھولوں کی سیج معلوم ہوتی ہیں اورانسان ہنستا کھیلتا اس وادئ پرخار سے گزرتا چلا جاتا ہے۔آج کے متعصب سماج میں دعوت حق کے فریضہ سے کماحقہ عہدہ برآ ہونے کے لئے ضروری ہے کہ زمینی سطح پر اپنے کام کا آغاز کیا جائے،عوام الناس سے اپنے تعلق کو مضبوط کیا جائے اور سماج کے حقیقی خیرخواہ کی حیثیت سے اپنے آپ کو متعارف کرایا جائے۔اس مشن سے وابستہ ہرفرد حسن اخلاق کا پیکر ہو،خدمت خلق کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہ دے اوراپنے حسن اخلاق کے ذریعہ لوگوں کو اپنا گرویدہ بنانے کی کوشش کرے۔اس لئے کہ حسن اخلاق ایسا نسخۂ کیمیا ہے جس میں سخت سے سخت متعصب شخص کے دل کو پگھلانے اوراسے مسخر کرنے کی صلاحیت بدرجہ اتم موجود ہے۔اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ آج کا سماج خواہ کتنا ہی متعصب کیوں نہ ہووہ روشنی کا متلاشی ہے۔اس کوضرورت ہے امن وآشتی کی،وہ محتاج ہے محبت وشفقت کا،اس کی نگاہیں عدل وانصاف کے لئے ترس رہی ہیں،وہ انسانی مساوات کا نمونہ دیکھنا چاہتا ہے اوراگرہم اس متعصب سماج کی سسکتی اورکراہتی ہوئی انسانیت کے سامنے جذباتیت سے عاری ہوکرحکمت وموعظت کے ساتھ ہدایت کی روشنی پیش کرنے میں کامیاب ہوگئے توکوئی وجہ نہیں ہے کہ وہ ان کے ذہن ودماغ کو متاثر نہ کرے اورانہیں سوچنے پر مجبور نہ کردے۔لیکن جیسا کہ واضح کیا گیا اس راہ میں مصائب کے روڑے اٹکائے جائیں گے،مخالفتوں کا طوفان سراٹھائے گا،ہمیں ہراساں کرنے کی کوشش کی جائے گی،قیدوبند کی صعوبتوں سے گزرنا ہوگا اورممکن ہے جان کا نذرانہ بھی پیش کرنا پڑجائے لیکن اللہ پر غیر متزلزل یقین ہمارا سہارا ہوگا،شہادت ہے مطلوب ومقصود مومن ہمارے عزم وحوصلہ کو مہمیز کرے گا اوراگرصبرواستقامت کے ساتھ ہم اس مشن سے وابستہ رہے اوراپنے نصب العین کی تکمیل کی کوشش کرتے رہے تو کامیابی ضرور ہمارا مقدر ہوگی،تاریکی چھٹے گی اورسپیدۂ سحرنمودار ہوگی۔

لبرل ازم اور کمیونیٹیرین ازم

ایک مطالعہ

سعود فیروز

انسانی فطرت تاریخی طور پر سماج وابستہ واقع ہوئی ہے۔اسی لئے علوم عمرانی میں فرد اور سماج ایک بنیادی اکائی کے طور پر ہمیشہ موجود رہے ہیں۔انسانی تاریخ کے ابتدائی ادوار میں جب انسان کا شعور اجتماع بالیدہ نہیں تھا اور اس کا طرز زندگی سہل اور سادہ تھا تب بھی فرد اور سماج تو موجود تھے لیکن ایک مبہم شناخت کے ساتھ۔انسان کا شعور جس قدر پختہ ہوتا گیا ہے، جس قدر اس کا لائف اسٹائل پیچیدہ تر ہوتا گیا ہے اسی قدر فرد اور سماج کی شناخت بھی واضح اور منفرد ہوتی چلی گئی ہے۔دور جدید کے آتے آتے ان دونوں اکائیوں میں اس حد تک انفرادیت پیدا ہوگئی کہ دونوں میں اصل کون ہے، اس پر تنازعہ پیدا ہوگیا۔مغرب میں سیاسی مفکرین کے ایک مکتبہ فکر نے سماج کو بنیادی اکائی ماننے سے انکار کرتے ہوئے فرد کی وکالت کی تو دوسرے نے فرد کا انکار کرتے ہوئے سماج کو کسی بھی سیاسی تجزیہ کی اساس قرار دیا۔اس نظریاتی کشاکش نے دو سیاسی نظریات کو جنم دیا۔فرد مرکوز نظام یعنی آزاد انفرادیت یا لبرل ازم (Liberal Individualism) اور سماج مرکوز نظام (Communitarianism)۔اس مختصر مقالہ میں انہی دو نظریات کا تعارف پیش کیا جارہا ہے۔

فرد اور سماج سے متعلق فکری جدال اسّی کی دہائی میں اس وقت شروع ہوا جب 1982 میں میکائل سینڈل کی کتاب Liberalism and the Limits of Justice منظر عام پر آئی۔اس کتاب میں سینڈل نے راولس کی کتاب A Theory of Justice مطبوعہ 1971 پر تبصرہ کرتے ہوئے اس کے لبرل افکار پر شدید تنقید کی۔سیاسی فکری حلقوں میں یہ بحث اسی وقت سے کسی نہ کسی شکل میں موضوع بحث بنی رہی ہے۔آج کے بہت سارے سیاسی مباحث دراصل اسی فکری جدال کے پروردہ ہیں۔دونوں افکار میں مرکزی اختلاف فرد اور سماج کی حیثیت کے تعین پر ہے۔یعنی یہ سوال کہ اصل کون ہے فرد یا سماج اور ریاست؟ آیا فرد اپنے معاملات بذات خود طئے کریں، بہترین ریاست کسے کہا جائے، یہ بھی فرد ہی کی فلاح کے نقطہ نظر سے طئے کیا جائے یا ان معاملات میں سماج، اجتماعی اداروں اور ریاست کا بھی عمل دخل تسلیم کیا جائے؟ اس سوال کے جواب میں دونوں نظریے مختلف اور متضاد نقطہ نظر رکھتے ہیں۔ان دونوں نظریات کو اس طرح کہا جاسکتا ہے کہ ایک نظریہ فرد کی آزادی اور فرد کے لامحدود حقوق واختیارات کا علمبردار ہے، جب کہ دوسرا سماج، اجتماعی اداروں اور ریاست کے رول پر زور دیتا ہے۔

لبرل ازم (Liberal Individualism) کا مفہوم اور اس کا ارتقا

فرد اور ریاست اور ریاست کے رول، ریاست کی سرگرمیوں کو بیان کرنے والے نظریات میں سے ایک لبرل ازم کا نظریہ ہے۔جو بات اس نظریہ کو دوسرے نظریات سے الگ کرتی ہے وہ اس کی فرد مرکوزیت ہے۔اس نظریہ کو متعارف کروانے میں آدم اسمتھ اور ہربرٹ اسپینسر کا کلیدی کردار رہا ہے۔بھارت میں مہادیو گوونداناڈے اس نظریہ کے وکیل رہے ہیں۔

لبرل ازم کا نقطہ نظر یہ ہے کہ افراد آزاد، باشعور اور اس قابل ہیں کہ اپنی زندگی کے اچھے اور برے کا تعین بذات خود کرسکیں۔افراد باشعور اس طور پر ہیں کہ اپنے مفادات کے بہترین عالم اور ناقد وہ خود ہیں۔وہ اس قابل ہیں کہ ایک خوش حال زندگی کسے کہتے ہیں اس کا تصور خود ہی تشکیل دیں۔ایک شخص کے خوش حال زندگی کے تصور میں اس کے اعتقادات، اخلاق واقدار اور وہ ساری چیزیں شامل ہیں جن کے مطابق وہ اپنی زندگی گزارنا چاہتا ہے۔افراد آزاد اس معنی میں ہیں کہ وہ وہ قابلیت اور استحقاق رکھتے ہیں جس کی بنا پر موجود سماجی روایات اور سرگرمیوں میں وہ اپنی شمولیت یا عدم شمولیت کا دعوی پیش کرسکیں۔یعنی افراد کسی بھی متعین سماجی تعلق کو قبول کرنے، رد کرنے یا اس پر نظر ثانی کرنے کے مجاز ہیں۔ایک شخص کو بحیثیت فرد یہ آزادی حاصل ہے کہ وہ اپنے آپ کو کسی بھی سماجی روایت سے کنارہ کش کرلے، اور یہ سوال اٹھائے کہ ہمیں اس روایت کو برقرار رکھنا چاہئے یا نہیں۔فرد پر سماج کی طرف سے کوئی متعین ذمہ داری یا حدود عائد نہیں ہیں۔اسے یہ آزادی حاصل ہے کہ اپنا نصب العین اور اپنے حدود وہ اپنی خواہش کے مطابق طئے کرے۔اس سلسلے میں راولس کا یہ مقولہ معروف ہے؛ بقول راولس؛

The self is prior to the ends, which are affirmed by it.

ذات کا مقام حدود سے پیش تر ہے، ذات ہی حدود کا تعین کرتی ہے"

فرد کی اس آزادی کو تسلیم کرنے کے بعد لازم ہوجاتا ہے کہ فرد کو وہ بنیادی وسائل اور آزادیاں فراہم کی جائیں جن کے ذریعے وہ اپنے اعتقاد اور اقدار کے مطابق حیات بسر کرسکے۔لبرل نظریہ کے حامی افراد ان ہی خیالات کی روشنی میں فرد اور ریاست، ریاست کے اختیارات وفرائض اور اس کا دائرہ کار طئے کرتے ہیں۔

لبرل ازم اور ریاست

ریاست سے متعلق لبرل ازم کا نظریہ فرد سے متعلق اس کے اس نظریہ کی بنیاد پر ہے جس میں فرد آزاد، باشعور اور خود مختار ہے۔ لبرل نظریہ کے مطابق فرد چونکہ آزاد، باشعور اور خود مختار ہے اس لئے بہترین اور خوش حال زندگی کسے کہا جائے، فرد کو کیسی زندگی گزارنی چاہئے، اس کے تعین کا موقع فرد ہی کو دیا جانا چاہئے۔ جب بہتر زندگی کے تصور کو ریاست ڈیفائن کرنے لگتی ہے اور اسی تصور کو اپنانے پر افراد کو مجبور کرتی ہے تو افراد کے مفادات مجروح ہوتے ہیں۔ اس نظریہ کے مطابق یہ تصور کہ فرد آزاد، باشعور اور خود مختار ہے، لازما ایک ایسی ریاست کے تصور کا مطالبہ کرتا ہے جو غیر جانبدار (Value-Neutral) ہو اور جس کی سرگرمیاں کم از کم ہوں۔ چنانچہ ریاست کی غیر جانب داری ہی لبرل ازم میں سیاست کی بنیادی قدر ہونی چاہئے۔ ریاست کا کم سے کم عمل دخل ہی درحقیقت لبرل نظریہ کی امتیازی خصوصیت ہے۔

غیر جانبدار ریاست ایک ایسی ریاست ہے جو فلاح اور کامیابی کے کسی انفرادی تصور کی حمایت، حفاظت اور تبلیغ نہ کرے، اسی طرح کسی تصور کی مذمت اور اس کے ساتھ امتیاز بھی نہ کرے۔ بلکہ وہ ایک ایسا اجتماعی ماحول فراہم کرے جس میں مختلف اور متضاد تصورات کو اختیار کیا جاسکے۔ اس نظریہ کے مطابق ریاست کوئی فطری ادارہ نہیں ہے۔ کیوں کہ عوام کے پاس ایک فطری پری۔ پالیٹیکل آزادی موجود ہے۔ حکومت انہی کی مرضی سے وجود پذیر ہوتی ہے جن پر حکومت کی جاتی ہے۔ اس لئے ریاست ایک مصنوعی اگرچہ ناگزیر ڈھانچے کا نام ہے۔ بعض لبرل نظریہ ساز مفکرین نے ریاست کو ایک ناگزیر برائی بھی قرار دیا ہے۔ اب چونکہ ریاست ایک ناگزیر برائی ہے اس لئے بہترین ریاست وہ ہے جو پبلک لائف میں کم سے کم مداخلت کرے۔ اس طرح ریاست کا رول، افراد کے حقوق کی ضمانت اور تحفظ تک محدود ہے۔ ریاست فرد کی آزادی میں صرف اس وقت مداخلت کر سکتی ہے جب ایک فرد کو دوسرے افراد کی آزادی مجروح کرنے سے باز رکھنا مقصود ہو۔

ریاست کا یہ تصور کہ وہ ایک محدود اور کم سے کم اختیارات رکھنے والا ادارہ ہے، دراصل نظریہ laissez-faire کی ترجمانی کرتا ہے۔ یہ فرانسیسی محاورہ اب ایک سیاسی اصول بن چکا ہے، اس کا مطلب ہے ''تنہا چھوڑ دو'' یا ''ہمیں کرنے دو'' یہ نظریہ اسی خیال کی وکالت کرتا ہے کہ فرد کو ریاست کی غیر ضروری اور ناقابل توجیہ مداخلت سے آزاد کر دینا چاہئے۔

ریاست کا یہ تصور کہ وہ ایک محدود اور کم سے کم اختیارات رکھنے والا ادارہ ہے، دراصل نظریہ laissez-faire کی ترجمانی کرتا ہے۔ یہ فرانسیسی محاورہ اب ایک سیاسی اصول بن چکا ہے، اس کا مطلب ہے ''تنہا چھوڑ دو'' یا ''ہمیں کرنے دو'' یہ نظریہ اسی خیال کی وکالت کرتا ہے کہ فرد کو ریاست کی غیر ضروری اور ناقابل توجیہ مداخلت سے آزاد کر دینا چاہئے۔

لبرل ازم کے تصور فرد، تصور ریاست پر مختلف نظریاتی حلقوں کی جانب سے شدید تنقیدیں بھی کی گئی ہیں۔ ان میں فاشزم، سَروَدیا، کمیونزم اور فیمنزم قابل ذکر ہیں۔ البتہ لبرل ازم پر سب سے زیادہ شدید تنقید نظریہ کمیونیٹیرین ازم (Communitarianism) میں نظر آتی ہے۔ ذیل میں اس کا جائزہ لیا جارہا ہے۔

کمیونیٹیرین ازم—ایک تعارف

اسّی کی دہائی سے ہی لبرل ازم کو کمیونٹیرین ازم کی جانب سے شدید چیلنج اور تنقید کا سامنا رہا ہے۔ اس اصطلاح کو 1982 میں، جیسا کہ اوپر ذکر آچکا ہے، میکائل سینڈل نے اپنی کتاب Liberalism and the Limits of Justice میں وضع کیا۔ جس میں اس نے جان راولس کی پیش کردہ لبرل ازم کی اساسات پر تنقیدی تبصرے کئے۔ میکائل سینڈل کے علاوہ بھی اس خیمے کے کئی سیاسی نظریہ سازوں نے لبرل ازم پر تنقیدیں کیں۔ یہ سارے نظریہ ساز ہیگل اور روسو سے متاثر تھے۔

کمیونیٹیر ین ازم میں سب سے کلیدی توجہ سماج یا ریاست کو حاصل ہے۔ دو یا دو سے زائد افراد اگر وہ فلاح کا مشترک تصور رکھتے ہیں تو وہ ایک طبقہ، ایک سماج بناتے ہیں۔ ان کا یہ مشترک تصور فلاح ہی ان کی شناخت ہوتی ہے۔ یہ کمیونیٹی ایک گہری دوستی، خاندانی رشتہ داری، پڑوسی اور حتی کہ ایک جامع سیاسی گروہ کی شکل میں ہوسکتی ہے۔ اس نظریہ کا اصرار ہے کہ ہر فرد اپنی شناخت، اپنی صلاحیت اور زندگی کا نصب العین سماجی تناظر میں ہی طئے کرتا ہے۔ ہم قدرتی طور پر ایک سماجی مخلوق ہیں۔ چوں کہ سماج ہی فرد کا مزاج طئے کرتا ہے، اس لئے سیاسی زندگی فرد مرکوز نہیں، سماج مرکوز ہونی چاہئے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ ایک مثالی ریاست کو ڈیفائن کرنے والے فلسفیانہ مباحث میں محور غور وفکر فرد نہیں سماج ہونا چاہئے۔

کمیونیٹیرن ازم کے مطابق لبرل ازم کا سب سے بنیادی نقص یہ ہے کہ یہ ناقابل توجیہ اور ناقابل برداشت حد تک فرد کی آزادی کا قائل ہے۔ فرد اور ریاست کے تعلق کے حوالے سے لبرل نظریہ ضرورت سے زیادہ محدود ہے اور یہ سماج کے صحیح کردار کی غلط نمائندگی کرتا ہے۔ کمیونیٹیر ین ازم کے مطابق فرد اور ریاست کا دو-سطحی تصور؛ ایک تصور فرد کی سطح پر اور دوسرا سماج کی سطح پر، کافی نہیں ہے۔ کمیونیٹیر ین ازم کا یہ بھی ماننا ہے کہ فرد کے حقوق اور آزادی کو ریاست اور سماج کے حقوق واختیارات پر ترجیح دے کر لبرل ازم سماجی ممبرشپ اور سماجی شناخت کو نظر انداز کر دیتا ہے۔

لبرل تصور ذات پر کمیونیٹیرین تنقید

کمیونیٹیر ین فکر کے حاملین لبرل ازم پر بالعموم دو تنقیدیں کرتے ہیں؛ ایک تو یہ کہ لبرل نظریہ سماج کی تحقیر پر مبنی ہے اور اس کی اہمیت کو تسلیم نہیں کرتا، دوسرے یہ کہ یہ ذات اور اس کے حدود کے سلسلے میں غلط مفروضات پر مبنی ہے۔ جیسا کہ اوپر اشارہ کیا گیا کہ لبرل ازم افراد کو سماج سے الگ ہو کر خود کفیل بننے کی تعلیم دیتا ہے۔ فرد کی اچھی زندگی کے لئے سماج کی ضرورت اور اس کے کردار کو لبرل ازم تسلیم نہیں کرتا۔ خوش حال زندگی کیا ہے، اس کا تصور افراد خود ڈیفائن کریں۔ کمیونیٹیر ین دانشوروں کا دعوی ہے کہ یہ ایک سطحی نظریہ ہے۔

کمیونیٹیرین نظریہ میں بہر حال فرد کی خوشحال زندگی کے لئے سماج ایک بنیادی عنصر اور جزو لاینفک ہے۔ افراد خواہ کسی قدر آزاد ہوں، طبقات اور سماج سے پرے ہو کر انسانی وجود کا تصور نہیں کیا جاسکتا۔ عوام مکمل اور مستقل طور پر تنہا نہیں رہ سکتے۔ بلکہ افراد کی تشکیل کی جاتی ہے، ان کی شناخت وہ ہوتی ہے جس طبقے سے اس کا تعلق ہوتا ہے۔ بحیثیت انسان ہم بنیادی طور پر ایک خاندان، مذہب، قبیلہ، نسل اور وطن کے ممبر ہوتے ہیں۔ یہی تعلقات یہ طئے کرتے ہیں کہ "ہم کون ہیں؟" اور "ہماری اقدار" کی تشکیل کرتے ہیں۔

اسی طرح فرد اور ریاست کے مابین تعلق، ذات اور اس کے حدود کے حوالے سے لبرل ازم کی کوتاہ نگاہی پر بھی کمیونیٹیرین نظریہ تنقید کرتا ہے۔ کمیونیٹیرین نظریہ کے مطابق ذات کے اس تصور کو قبول کر لینا کسی فرد کو لاتعلق سمجھنے کی طرح ہے۔ اس میں فرد اور ریاست کا تعلق محض رضا کارانہ نوعیت کا ہو کر رہ جاتا ہے۔ کمیونیٹیرین دانشور اس رضا کارانہ تعلق پر تنقید کرتے ہیں۔ ان کے مطابق یہ تصویر سماج سے ہماری حقیقی وابستگی کو نظر انداز کرتی ہے۔ مزید تنقید کرتے ہوئے وہ سوال کرتے ہیں کہ جو اقدار موجود ہیں کیا انہیں تبدیل کیا جاسکتا ہے اور ان کی جگہ نئے اقدار لائے جاسکتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے انسان بنیادی طور پر ایک سماجی مخلوق ہے۔ مثلاً ہم اپنے سماجی اور طبقاتی تعلقات کو نہ کبھی منتخب کرتے ہیں نہ کبھی اس کی تردید ہی کرتے ہیں، ہم اسے دریافت کرتے ہیں۔ ہم نہ آزاد ہیں اور نہ اپنے سماجی حدود سے بہت دور ہی کھڑے ہیں، بلکہ ہم اپنے آپ کو ان میں واقع اور موجود پاتے ہیں۔ مثلاً ہم پیدائشی طور پر اپنے خاندان، مذہب یا نسل کا انتخاب نہیں کرتے، بلکہ ہم اپنے آپ کو اس میں موجود پاتے ہیں۔ اس کے بعد ہی ہم فلاح اور خوشحالی کا اپنا تصور قایم کرتے ہیں۔ پھر ہم اپنے خاندان، مذہب یا ملک میں اپنی صحیح پوزیشن اور مقام ومرتبہ طئے کرتے ہیں۔ کمیونیٹیرین ازم کے مطابق ہم اپنے سماجی کردار اور طبقاتی شناخت سے کبھی آزاد نہیں ہیں۔ میکائل سینڈل کہتا ہے کہ "میں اپنے اس کردار کی جس میں میں خود کو پاتا ہوں، توجیہ تو ضرور کر سکتا ہوں مگر سرے سے کردار ہی کا انکار نہیں کر سکتا۔ اور نہ ان میں پنہاں اہداف کو بے کار قرار دے سکتا ہوں۔" یہی وہ نظریاتی بنیادیں ہیں جن کی اساس پر کمیونیٹیرین نظریہ لبرل ازم کے افکار ونظریات پر خط تنسیخ چلا دیتا ہے۔

غیر جانبدار ریاست کے تصور پر کمیونیٹیرین تنقید

کمیونیٹیرین نظریہ کے علم بردار لبرل ازم پر جو دوسری اہم تنقید کرتے ہیں وہ لبرل ازم کا غیر جانبدار ریاست کا تصور ہے۔ جیسا کہ بتایا گیا، لبرل دانشور ریاست کو ایک غیر جانب دار اور کم سے کم اختیارات رکھنے والا سیاسی ادارہ مانتے ہیں۔ جس کے اختیارات محض افراد کے حقوق اور آزادی کے تحفظ اور لاء اینڈ آرڈر کے استحکام تک محدود ہیں۔ چوں کہ افراد آزاد، باشعور اور خود مختار ہیں، اور کسی بھی سیاسی نظام کی اساس ہیں، اس لئے ریاست کا غیر جانبدار ہونا لازمی ہے۔ اور ریاست کے غیر جانب دار ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اس کا کسی نظریہ زندگی سے تعلق نہ ہو۔ جو فلاح اور بہتری کے مختلف تصورات کو برداشت کرتی ہو۔

کمیونیٹیرین دانشور فرد کی خود مختاری اور ریاست کی غیر جانب داری کے اس تعلق کی مخالفت کرتے ہیں۔ ان کے مطابق یہ نظریہ اس غلط فہمی پر قایم ہے کہ فرد کی خود مختاری کی

اجتماعی مفاد ایک پائیدار تصور کا نام ہے جو سماج کی صحیح تصور حیات کی طرف رہ نمائی کرتا ہے۔ بجائے اس کے کہ مختلف انفرادی تصورات پر غیر جانب دار رہے، بہتری اور فلاح کا اجتماعی تصور افراد کے لئے وہ معیارات فراہم کرتا ہے جس کے ذریعے انفرادی ترجیحات اور اقدار کی جانچ پڑتال کی جاسکتی ہے۔ الغرض فلاح کا اجتماعی تصور ہی وہ اساس ہے جس کی روشنی میں انفرادی تصورات کی تعیین قدر کی جاسکتی ہے۔

حفاظت صرف اسی صورت میں ہوسکتی ہے جب کہ بہتر طرز زندگی کا فیصلہ کسی سیاسی اتھاریٹی کے باہر، محض افراد کی خواہشات کی بنیاد پر ہو۔ چنانچہ اس مفروضہ کو مسترد کرتے ہوئے کمیونیٹیرین دانشور کہتے ہیں کہ درحقیقت فرد کو اپنے انفرادی فیصلے لینے کے لئے اجتماعی طور پر تجربات کے لین دین کی ضرورت ہوتی ہے۔ اسی لئے کمیونیٹیرین نظریہ اجتماعی مفادات کے حصول کے لئے انفرادی مفادات سے دست برداری کی وکالت کرتا ہے۔ اجتماعی مفاد ایک پائیدار تصور کا نام ہے جو سماج کی صحیح تصور حیات کی طرف رہ نمائی کرتا ہے۔ بجائے اس کے کہ مختلف انفرادی تصورات پر غیر جانب دار رہے، بہتری اور فلاح کا اجتماعی تصور افراد کے لئے وہ معیارات فراہم کرتا ہے جس کے ذریعے انفرادی ترجیحات اور اقدار کی جانچ پڑتال کی جاسکتی ہے۔ الغرض فلاح کا اجتماعی تصور ہی وہ اساس ہے جس کی روشنی میں انفرادی تصورات کی تعیین قدر کی جاسکتی ہے۔ یعنی اس بنیاد پر کہ انفرادی تصور اجتماعی تصور سے کتنی موافقت رکھتا ہے اور اس کے حصول میں کتنا تعاون کرتا ہے۔ اسی لئے کمیونیٹیرین نظریہ کے مطابق انصاف پر قایم ریاست وہ نہیں ہے جو افراد کے ذاتی تصورات سے خود کو الگ تھلگ رکھتی ہو۔ بلکہ انصاف پر قایم ریاست وہ ہے جو اجتماعی تصور فلاح سے مطابقت رکھنے والے مختلف تصورات اختیار کرنے پر اپنے شہریوں کی حوصلہ افزائی کرے، اور ان تصورات کی نفی کرے جو اجتماعی تصور سے متصادم ہو۔ اس طرح ریاست کا فرض یہ بھی ہے کہ وہ ایک بہتر حیات بسر کرنے کے سلسلے میں اپنے شہریوں کی رہ نمائی کرے۔ اس نظریہ کا مزید ماننا یہ ہے کہ ایک اجتماعی تصور فلاح صرف افراد کی صحیح رہ نمائی کے لئے ضروری نہیں ہے بلکہ عدل وانصاف پر قائم ایک سیاسی اجتماعیت قایم کرنے کے لئے بھی ناگزیر ہے۔

مذاہب عالم کی
آسمانی کتابیں

محمد معاذ

انسانی تاریخ کا مطالعہ دراصل قوموں کے عروج و زوال کی داستان ہے۔ مستند ذرائع سے معلوم ہوتا ہے کہ تاریخ کے مختلف ادوار میں انسان کسی نہ کسی شکل میں اپنے رب کو یاد کرتا رہا ہے۔ آج بھی دنیا کا کوئی گوشہ ایسا نہیں ہے جہاں آثارِ مذہب بالکل ناپید ہوں۔ بلکہ رواں صدی مذہب کی نشاۃ ثانیہ محسوس ہوتی ہے۔ آج دنیا تمام ازموں اور نظام ہائے حیات کو اپنا کر بے قراری کا شکار ہے اور اپنے قلب کو مطمئن کرنے کے لیے پیغام ربانی کو سننے کے لیے بے چین ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اب یورپ اور مغربی دنیا میں بھی احیائے مذہب کی تحریکات اثر انداز ہو رہی ہیں۔

دنیا کے نمایاں مذاہب کے ماننے والے اپنے پاس ایک یا زائد آسمانی کتابیں ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں جو ایک حد تک ان کے مذہب کی اساسی تعلیمات کو بیان کرتی ہیں۔ عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ تمام مذاہب میں اچھی باتیں ہیں، اخلاقی تعلیمات ہیں، لہٰذا یہ تمام ہی مذاہب صحیح ہیں۔ قرآن کریم اس مفروضے کے جواب میں صحیح حقیقت بیان کرتا ہے۔ ''ابتداء میں سب لوگ ایک ہی طریقے پر تھے۔ (پھر یہ حالت باقی نہ رہی اور اختلافات رونما ہوئے) تب اللہ نے نبی بھیجے جو راست روی پر بشارت دینے والے اور کجروی کے نتائج سے ڈرانے والے تھے، اور اُن کے ساتھ کتابِ برحق نازل کی تا کہ حق کے بارے میں لوگوں کے درمیان جو اختلافات رونما ہو گئے تھے، ان کا فیصلہ کرے — (اور ان اختلافات کے رونما ہونے کی وجہ یہ نہ تھی کہ ابتداء میں لوگوں کو حق بتایا نہیں گیا تھا۔ نہیں) اختلاف اُن لوگوں نے کیا، جنھیں حق کا علم دیا جا چکا تھا۔ انھوں نے روشن ہدایات پا لینے کے بعد محض اس لیے حق کو چھوڑ کر مختلف طریقے نکالے کہ وہ آپس میں زیادتی کرنا چاہتے تھے۔ پس جو لوگ انبیاء پر ایمان لے آئے، انھیں اللہ نے اپنے اِذن سے اُس حق کا راستہ دکھا دیا، جس میں لوگوں نے اختلاف کیا تھا۔ اللہ جسے چاہتا ہے، راہِ راست دکھا دیتا ہے۔'' (البقرۃ: ۲۱۳)

یہ آیت بتاتی ہے کہ ابتداء میں تمام نوعِ انسانی کا دین اسلام تھا۔ زمانہ کے ساتھ لوگ اپنے اصل دین کو بھلا بیٹھے اور چند وضعی ادیان پر عمل پیرا ہونے لگے۔ قرآن حکیم کی تصریحات کے مطابق حضرت موسیٰؑ کو توریت، حضرت عیسیٰؑ کو انجیل اور حضرت داؤدؑ کو زبور عطا کی گئی۔ علاوہ ازیں قرآن حکیم میں صحف ابراہیمؑ اور موسیٰؑ کا بھی ذکر ہے۔ لیکن جس طرح قرآن تمام انبیاء کا ذکر نہیں کرتا اسی طرح تمام آسمانی کتابوں کا بھی ذکر نہیں کرتا۔

زیرِ نظر مضمون میں چار بڑے اور نمایاں مذاہب کی آسمانی کتابوں کا تعارف جناب غلام احمد پرویز کی کتاب ''مذاہب عالم کی آسمانیں کتابیں'' کی روشنی میں پیش کیا جائے گا۔

کتب تورات:

Old Testament یا عہد نامہ عتیق دراصل ۳۹ کتابوں کا مجموعہ ہے جن میں سے پانچ کے متعلق اہلِ مذہب کا دعویٰ ہے کہ یہ حضرت موسیٰؑ نے تحریر کی ہیں۔ ان ۳۹ کتابوں کا مطالعہ یہ راز افشاں کرتا ہے کہ بعض ایسی کتابیں بھی ہیں جو کہ اب ضائع ہو چکی ہیں اور وہ عہد نامہ عتیق کا حصہ تھیں۔ یہ کتابیں ۴۵-۴۴۴ میں عزرا نے اپنے حافظہ کی مدد سے مرتب کی تھیں ان کے بیان کے مطابق مرتب کردہ کتابوں کی اصل تعداد ۲۰۴ تھی۔

دوسری صدی قبل مسیح میں یونانیوں نے یروشلم پر حملہ کیا تو کتب مقدسہ بھی اس کی زد میں آئیں۔ اس کے بعد انھیں پھر مرتب کیا گیا۔ ۷۰ء میں رومیوں نے یروشلم کو تباہ کر دیا اور وہ ان کتابوں کے نسخے اپنے ساتھ روما لے گئے۔ مشہور مؤرخ جوزیفس کا بیان ہے کہ ان کتابوں کا ترجمہ یونانی زبان میں کیا گیا۔ ایسی ۲۲ کتابوں کا ذکر جوزیفس نے کیا ہے۔ (بحوالہ مذاہب عالم کی آسمانی کتابیں ص ۲۱)۔

یعنی یروشلم کی تباہی کے بعد جوزیفس کے مطابق یہودیوں کے ہاں صرف ۲۲ کتابیں تھیں۔ غور طلب نکتہ ہے کہ عذرا (فقیہ) نے ۲۰۴ کتابوں کو مرتب کیا تھا اور ۳۹ کتابوں کو آج کتب تورات کی حیثیت سے پیش کیا جاتا ہے۔ یعنی اتنا تو ضرور ہے کہ ان نام نہاد آسمانی نسخوں کا ایک حصہ وضعی ہے۔ عہد نامہ عتیق کی تحریفات کا ذکر انسائیکلوپیڈیا

برٹانیکا میں ان الفاظ میں ملتا ہے: ''عرصہ دراز تک کتب مقدسہ کا مطالعہ جرح وتعدیل کے مسلمہ اصول سے محروم رہا۔ یہود محض اس عبرانی نسخہ کی پیروی کرتے تھے جس کی نسبت مشہور تھا کہ غالباً دوسری صدی عیسوی میں مرتب کیا گیا ہے اور بعد ازاں احتیاط سے محفوظ رکھا گیا لیکن اس نسخہ میں چند تحریفات تو ایسی ہیں جو اب صاف صاف نظر آجاتی ہیں اور غالباً ایک کافی تعداد ایسی تحریفات کی بھی ہے جن کی شاید پورے طور پر قلعی نہ کھل سکے۔ (ص ۲۸، مذاہب عالم کی آسمانی کتابیں)

اسی طرح جوزف اپنی کتاب Judaism as creed and life میں لکھتا ہے ''بائبل کی بعض کہانیاں بالکل افسانے ہیں، اگرچہ نہایت حسین اور عبرت آموز، باقی رہے علوم وفنون سو وہ اس زمانہ کی سطح کے مطابق ہیں جس میں ان کتابوں کے مصنف پیدا ہوئے۔

ان تصریحات سے یہ اہم حقیقت واضح ہوگئی کہ موجودہ عہد نامہ عتیق خود مذہبی طبقہ کے علماء کے نزدیک بھی استناد سے محروم ہے۔ یعنی مذہب کی اصل تعلیمات تک رسائی ان کتب مقدسہ کے ذریعہ ممکن نہیں ہے۔ Leslie Paul اپنی کتاب The Annihilation میں لکھتا ہے کہ ''عہد نامہ عتیق یا جدید، سائنٹفک اصطلاح میں خدا کے الفاظ نہیں۔'' (ص ۱۷۵)

عہد نامہ جدید اناجیل:

عیسائی مذہب کے ماننے والے بھی اپنے پاس خدا کی کتاب ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ قرآنِ کریم نے انجیل کے من جانب اللہ ہونے کی تصدیق ان الفاظ میں کی ہے: ''اس نے تم پر یہ کتاب نازل کی، جو حق لے کر آئی ہے اور ان کتابوں کی تصدیق کر رہی ہے جو پہلے سے آئی ہوئی تھیں۔ اس سے پہلے وہ انسانوں کی ہدایت کے لیے تورات اور انجیل نازل کر چکا ہے۔ (آل عمران: ۳) اس آیتِ کریمہ میں کس انجیل کے من جانب اللہ ہونے کی تصدیق کی گئی ہے؟ اس کا جواب دیتے ہوئے مولانا ابوالاعلیٰ مودودیؒ لکھتے ہیں کہ ''انجیل نام ہے دراصل ان الہامی خطبات کا اور اقوال کا جو مسیح علیہ السلام نے اپنی زندگی کے آخری ڈھائی تین برس میں بحیثیت نبی ارشاد فرمائے۔ وہ کلمات طیبات آپ کی زندگی میں لکھے اور مرتب کیے گئے تھے یا نہیں اس کے متعلق اب ہمارے پاس کوئی ذریعہ معلومات نہیں ہے۔ ممکن ہے بعض لوگوں نے انھیں نوٹ کر لیا ہو اور ممکن ہے کہ سننے والے معتقدین نے ان کو زبانی یاد کر رکھا ہو۔ بہرحال ایک مدت کے بعد جب آنجناب کی سیرت پاک پر مختلف رسالے لکھے گئے تو ان میں تاریخی بیان کے ساتھ ساتھ وہ خطبات اور ارشادات بھی جگہ جگہ حسب موقع درج کر دیے گئے، جو ان رسالوں کے مصنفین تک زبانی روایات اور تحریری یادداشتوں کے ذریعے پہنچے تھے۔ آج متی، مرقس، لوقا اور یوحنا کی جن کتابوں کو انجیل کہا جاتا ہے دراصل وہ انجیل نہیں ہیں بلکہ انجیل حضرت مسیح علیہ السلام کے وہ ارشادات ہیں جو ان کے اندر درج ہیں۔'' (تفہیم القرآن، حصہ اول، ص ۲۳۲)

یہ معلوم ہوجانے کے بعد کہ قرآن حکیم کی رو سے اناجیل اربعہ کا کون سا حصہ دراصل انجیل کہلائے جانے کا مستحق ہے۔ یہ تحقیق بھی ضروری ہے کہ موجودہ اناجیل کی عیسائی مذہب میں کیا حیثیت ہے اور وہ کس طرح وجود میں آئیں۔ سب سے پہلے اس سلسلے کی پہلی کتاب متی کی انجیل پر نظر ڈالیے۔

متی کی انجیل: اناجیل اربعہ کی مذہبی حیثیت کے بارے میں جناب عماد الحسن آزاد فاروقی لکھتے ہیں کہ ''عیسائیت کی یہ اولین مقدس تحریریں نہ صرف عیسائیت کے ابتدائی عقائد، بلکہ حضرت عیسیٰؑ کے بارے میں بھی جاننے کے لیے ہمارا واحد بنیادی ماخذ ہیں۔ اس مجموعہ میں چار اناجیل یعنی انجیل بہ روایت متی، انجیل بہ روایت مرقس انجیل بہ روایت لوقا، انجیل بہ روایت یوحنا شامل ہیں۔'' (ص ۲۷۹، دنیا کے بڑے مذاہب)

اس اقتباس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ان چار اناجیل کی اساسی حیثیت مذہب عیسائیت میں مسلم ہے۔ متی کے متعلق کہا جاتا ہے کہ یہ سب سے قدیم ہے حالانکہ اس کے بارے میں یہ ابھی تک متعین نہیں ہوسکا ہے کہ یہ کس نے مرتب کی اور کس سن میں مرتب کی گئی۔ زمانۂ تالیف کے متعلق جناب غلام احمد پرویزؔ رقم طراز ہیں: ''عہد تالیف کے متعلق عام طور پر خیال ہے کہ یہ ۶۱ء اور ۶۵ء کے درمیان مرتب ہوئی لیکن پروفیسر ہارنک کے نزدیک اس کا زمانۂ تالیف ۸۰ء اور ۱۰۰ء کے درمیان ہے۔ بہرحال زمانۂ تالیف ۶۱ء ہو یا ۱۰۰ء تاریخ کے صفحات میں اس انجیل کا نشان ۱۷۳ء سے قبل نہیں ملتا۔'' (ص ۴۵، مذاہب عالم کی آسمانی کتابیں)

حضرت عیسیٰؑ کے حواریوں کے متعلق معلوم ذرائع یہ بتاتے ہیں کہ وہ سب کے سب اَن پڑھ تھے۔ حضرت عیسیٰؑ کی زبان آرامی تھی لیکن یہ انجیل یونانی زبان میں لکھی گئی بعد میں اس کا ترجمہ عبرانی میں کیا گیا۔

مرقس: اس بارے میں اختلاف ہے کہ متی زیادہ قدیم ہے یا مرقس۔ بعض مؤرخین کا خیال ہے کہ سب سے قدیمی انجیل مرقس ہے۔ اس کتاب (انجیل کا) زمانۂ تالیف ۶۴ء ہے۔ (بحوالہ تاریخ کلیسا)

لوقا: تیسری انجیل لوقاؔ ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اسے پہلی صدی کے اخیر میں مرتب کیا گیا۔

یوحنا: چوتھی انجیل یوحنا کی ہے۔ جسے عام طور پر حضرت عیسیٰؑ کے حواری یوحنؔا کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔ لیکن چونکہ جدید تحقیق کے مطابق حواری کتابت کے فن سے ناواقف تھے اس لیے بعض علماء مذاہب کے مطابق یہ یوحنا ایشیائے کوچک کا رہنے والا تھا۔ اس انجیل میں فلسفہ یونان کی پوری پوری چاشنی موجود ہے۔

جناب غلام احمد پرویزؒ اپنی کتاب ''مذاہب عالم کی آسمانی کتابیں'' میں ان اناجیل پر مختلف اہلِ نظر حضرات کے بصیرت آموز تبصرے نقل کرتے ہیں ان میں سے صرف دو قارئین کی نظر ہیں۔ موسیو رینان لکھتا ہے:

''حضرت مسیح کی تعلیم میں عملی اخلاقیات یا شرعی قوانین کا کوئی سراغ نہیں ملتا۔ صرف ایک مرتبہ شادی کے بارے میں آپ نے حتمی طور پر کچھ فرمایا اور طلاق کی ممانعت کی۔'' (ص ۴۸، مذاہب عالم کی آسمانی کتابیں) اناجیل کے متعلق جوڈ لکھتا ہے کہ ''سیاسی اور اقتصادی معاملات کے متعلق (حضرت) عیسیٰؑ کی تعلیم افسوس ناک حد تک مبہم ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ مسیحی علماء سرمایہ داری، استعماریت، غلامی، جنگ، قید و بند (دشمنوں) کو زندہ جلانا اور تکلیف دینا، غرضیکہ جس چیز کو چاہیں بلا دقت مسیح کی تعلیم سے ثابت کر سکتے ہیں۔'' (ص ۴۸، ایضاً)

اسی طرح اناجیل اربعہ کی بہت سی تعلیمات باہم متضاد ہیں اور خدا کا صحیح اور واضح تصور پیش کرنے سے قاصر ہیں۔ اسی طرح حضرت عیسیٰؑ کا کردار بھی اکثر مقامات پر بری طرح مسخ کر کے پیش کیا گیا ہے جو سب سے زیادہ تکلیف دہ پہلو ہے۔ Charles Gore لکھتا ہے کہ ''سینٹ کروسٹم کی طرح میرے لیے بھی اس امر کو تسلیم کرنا ناممکن ہے کہ اناجیل غلطی سے مبرا ہیں۔'' (The Holy Spirit and Church)

(جاری)

گذشتہ سے پیوستہ

زیرنظرتحریر جناب غلام صمدانی صاحب (ناندیڑ، مہاراشٹرا) سے مذہب اسلام کے متعلق لئے گئے ایک بین المذاہب مکالماتی پروگرام کے انٹرویو کی تلخیص ہے، جس کے میزبان بالاجی چرڈے اور وشوادھار دیشمکھ صاحب تھے۔ مراٹھی زبان سے قارئین رفیق منزل کے لئے ترجمہ عبدالرحمٰن، ناندیڑ نے کیا۔

سوال : آپ نے ابھی کہا[1] کہ قرآن صحیح اور غلط کو پرکھنے کی کسوٹی ہے۔غیر مسلم قرآن کا مطالعہ کرنا چاہتے ہیں لیکن قرآن کی اصل زبان عربی ہے۔ ۱۷ ویں صدی تک قرآن کا دیگر زبانوں میں تجربہ کرنے پر پابندی تھی۔ ۱۶۱۷ء میں قرآن کا فرانس زبان میں ترجمہ ہوا اُردو زبان میں ۱۸۶۱ء میں اور مراٹھی زبان کی بات کی جائے تو ۱۹۱۶ء میں ساتویں نظام نے ترجمہ کروایا اور اُس کی دوسری اشاعت حکومت مہاراشٹرا کے تعاون سے عمل میں آئی اور اس کا مقدمہ سیکریٹری تعلیم ڈاکٹر اے ابوشیخ نے لکھا ہے۔ اُنھوں نے اس میں مطالعہ قرآن کے ۲۷ اُصول بتائے ہے۔ اِس وقت میں ان میں سے دو تین اُصولوں کی بات کروں گا اور میرا یہ سوال اسی پر ہے۔ ۱۷ واں اُصول ہے کہ کافر اور ملحد کو اصل قرآن نہیں دینا چاہئے، البتہ زبانی تعلیم دی جاسکتی ہے۔ ۲۲ واں اُصول ہے کہ قرآن کے اوپر کوئی کتاب رکھنا اسکی بے ادبی ہے ۲۳ واں اُصول ہے کہ قرآن پُرانا ہوجائے اور مطالعہ کے قابل نہ رہے تو اسے کسی صاف کپڑے میں لپیٹ کر کسی پاک جگہ دفن کیا جائے۔

مجھے بتائیں کہ اگر اتنے سخت اُصول ہوں گے تو کسی غیر مسلم کو قرآن کا مطالعہ کرنے میں دُشواری پیش نہیں آئے گی؟ آپ کی کیا رائے ہے؟

جواب : یہ اُصول جو اُنہوں نے لکھے ہیں یہ اُن کی ذاتی رائے پر مبنی ہیں، قرآن اور حدیث سے ماخوذ نہیں ہیں۔ ہمارے نزدیک معیار قرآن اور حدیث ہیں۔ اسی کی بنیاد پر ہم کوئی نتیجہ اخذ کرتے ہیں۔ لیکن یہ بات دُرست ہے کہ ہم قرآن صرف ایسے ہی لوگوں کو دیتے ہیں جن میں تھوڑا بہت Common Sense ہو۔ کہ یہ کتاب ایک مذہب کی مقدس کتاب ہے۔ یہ صرف ایک احتیاط ہے، اُصول نہیں۔ کسی دُشمن نے بھی اگر قرآن مانگا تو میں اسے دوں گا اس لئے کہ وہ انسان ہے اور قرآن کا مضمون بھی انسان ہی ہے۔ جس طرح ہمارے مضامین ہوتے ہیں Chemistry, Physics, Biology بالکل اس طرح قرآن کا مضمون انسان ہے؛ کہ انسان کس طریقے سے اپنی زندگی بسر کرے؟ اس کا عقیدہ کیا ہو؟ اسی طرح کئی چھوٹی چھوٹی وضاحتیں قرآن مجید میں موجود ہیں۔ اگر ہم کسی کو قرآن نہ دیں اور وہ گھٹیا زندگی گزارتا ہے تو ہم اس سے کہیں کہ تمہاری زندگی بے اعتدالی کی زندگی ہے۔ تو وہ پوچھے گا کہ اعتدال کیا ہے تو بغیر قرآن کا مطالعہ کئے اس کی سمجھ میں اعتدال کا درست تصور نہیں آئے گا۔ جیسے قرآن جس طریقے سے بھی سمجھ میں آتا ہوا سے اُس طریقے سے سمجھنا فرض ہے۔ بلغوا عنی و لو آیة تم کو جتنا معلوم ہے اُتنا دوسروں تک پہنچادو، یہی قرآن کی تعلیم ہے۔

سوال : مُسلم سماج میں ۷۸۶ بہت مشہور نمبر ہے گاڑی کی نمبر پلیٹ پر، کتاب پر، گھر پر یہاں تک کہ بعض فلموں میں بھی دکھایا جاتا ہے ہمیں اس سے متعلق کافی سوالات موصول ہوئے ہیں۔

جواب : اصل بات یہ ہے کہ بھارتی مسلمانوں (جن کی نسل ہندوؤں سے ہے) کے باپ دادا ہندو تھے۔ یہ وہیں سے چلی آرہی کچھ روایتوں کا نتیجہ ہے جن کا تعلق احترام سے ہے۔ وہ اس طرح کہ مثلاً آپ نے دیکھا ہوگا کہ کوئی نئی موٹر گاڑی خریدتا ہے تو اس پر دیوی کی لال پٹی باندھ لیتا ہے۔ یہ کس لئے کرتا ہے؟ یہ اس لئے کہ اس کا عقیدہ ہے کہ دیوی کی لال پٹی باندھ لینے سے دیوی کا آشیر واد رہے گا اور حادثہ پیش نہیں آئے گا اور میں مروں گا نہیں۔ لیکن ایسا کچھ نہیں۔ جس شخص کی موت مقرر ہے وہ ضرور مرتا ہے۔ ۷۸۶ اس لئے کہا جاتا ہے کہ عرب لوگ بہت ہوشیار تھے اور اتنے زبردست شاعر تھے کہ جو سانچے بنائے ہیں۔ آج ۲۱ ویں صدی میں بھی انگریزی، اُردو، فارسی اس کے آگے نہیں پہنچ سکی۔ مفعول فاعلات مفاعل فاعلن اگر ایسا مصرعہ ہے تو دوسرا مصرعہ یعنی اس طرز کا ہوتا تھا۔ اسی طرح سے شاعری کرنے والے موجود تھے۔ ریاضی، شاعری اور شراب پینے میں نمبر ایک تھے۔ ہندوستان کے مسلمانوں میں ان کی ہندوی روایات کی وجہ سے احترام کے کچھ

[1] انٹرویو کا پہلا حصہ ماہنامہ رفیق منزل اگست 2017 کے شمارے میں ملاحظہ فرمائیں۔

طریقے رواج پا گئے ہیں ان کا مذہب سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ مثلاً بسم اللہ الرحمن الرحیم، قرآن کی آیت ہے۔ مان لیجئے ہم نے ایک خط لکھا جس پر یہ درج تھا۔ وہ خط زمین پر گر گیا اور اس پر کسی کا پیر پڑ گیا تو خدا کے نام کی بے ادبی ہوگی۔ تو راستہ کیا ہے؟ تو یہاں کے مسلمانوں نے یہ طریقہ ایجاد کیا کہ الفاظ کو نمبرات دے دیے۔ مثلاً الف مطلب ایک، ب یعنی دو۔ اسی طرح عربی زبان میں اگر بسم اللہ کی جمع کی جائے تو ۷۸٦ نمبر آتا ہے۔ اور انھوں نے سوچا کہ اپنی نیت تو صاف ہے اس لئے نمبر بھی چلے گا۔ اور ہماری آیت کی بے ادبی کے مواقع بھی ختم ہو جائیں گے۔ اس پورے معاملے کے پیچھے کوئی مذہبی اصول کارفرما نہیں ہے۔

سوال: صوفی اور علماء ان دونوں کے اسلام میں کیا فرق ہے؟ لوگ کہتے ہیں کہ صوفی اسلام اصل اسلام نہیں ہے بلکہ بعد کے انسانوں نے کی ہوئی تبدیلی ہے؟

جواب: یونانی فلسفہ کے مسلمانوں پر کئی اثرات پڑے ہیں۔ جس وقت یونانی فلسفہ کا بہت زور و دبدبہ تھا اس وقت ادویت واد (وحدت الوجود) کا فروغ ہوا۔ اس تصور کا مطلب یہ ہے کہ خدا کے علاوہ کسی اور شئے کا کوئی وجود ہی نہیں ہے۔ میں اور میرا خدا یکساں ہے۔ میری ذات ترقی کرتے کرتے خدا کی ذات میں ضم ہو جائے گی۔ اور یہی میری نجات ہوگی۔ وحدت الوجود کا یہ مکمل تصور اسلام کا عین ضد ہے۔ اسلام کہتا ہے کہ میں اور میرا خدا مختلف ہیں۔

اسلام کہتا ہے کہ میرے اوپر ایک خدا ہے جو کہ میرے اوپر کنٹرول رکھتا ہے میں اس کے سامنے جوابدہ ہوں اور اس احساس جوابدہی کے نتیجے میں، میں سیدھا رہتا ہوں۔ بالفرض ایسا نہ ہو اور مجھے محسوس ہو کہ میں اور خدا ایک ہی ہے تو میں کسی اخلاقی بندھن کو قبول نہیں کروں گا۔ ماں اور بہن سے جنسی تعلق کیوں قائم نہیں کیا جاتا اس کا جواب اس وحدت الوجود میں نہیں ہے۔

اُس وقت اس یونانی تصور کا لوگوں پر گہرا اثر ہوا۔ خصوصاً ان لوگوں پر جو کہ مسلم تھے۔ صوفیوں نے اس گروہ کو شروع کیا۔ صوفی سنتوں نے یہ بات پھیلائی کہ خدا اور رسول ایک ہی ہیں اور ان میں کچھ فرق نہیں۔ یعنی کہ رسول ایک اچھا انسان اور خدا ایک ہی ہیں یہ اصل تصوف ہے۔ نفس کا تزکیہ کرنا یہ اسلام میں قابل قبول ہے۔ لیکن جو مشہور و معروف تصوف ہے وہ اسلام سے بالکل مختلف ہے۔ اورنگ زیب کے زمانے میں ایک شخص کہا کرتا تھا انا الحق، کہ میں ہی خدا ہوں۔ اورنگ زیب نے اس بلا کر کہا کہ تیرے اس عمل سے لوگ گمراہ ہو رہے ہیں۔ لیکن اُس شخص نے اپنے اس عمل کو ترک کرنے سے انکار کر دیا جس کے نتیجے میں اورنگ زیب نے اس کا سر قلم کر دیا۔ لہٰذا اس طریقے سے ادویت کے تصّور کو اسلام نے بالکل نکال پھینکا ہے۔ صوفی تصور ادویت کی طرف لے جانے والا نظریہ ہے جس کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

سوال: اس کا مطلب یہ کہ درگاہ، قبور یہ سب چیزیں اصل میں اسلام کو قبول نہیں ہے۔

جواب: درگاہ اور قبور کا صوفی ازم سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ درگاہیں تو عام طور پر ان لوگوں کی ہوتی ہیں جنھوں نے یہاں ہندوستان کی جانب ہجرت کی اور یہاں لوگوں میں اسلام کی تبلیغ کی۔ جیسا کے میرے دادا نے قندھار گاؤں میں سب سے پہلے اسلام قبول کیا وہ ایک مندر کے پجاری تھے۔ وہاں سنت آئے تھے۔ جناب رفیع الدین، اُن کو وہاں کی زبان نہیں آتی تھی لیکن لوگ ان کے عمل و اخلاق سے بہت متاثر ہوتے تھے اور اپنے مسائل لے کر ان کے سامنے حاضر ہوتے اور مسائل حل ہونے پر ان کے پاؤں پڑتے تو وہ ایسا کرنے پر سخت منع کرتے۔ اور اس موقع کو وہ دین کی دعوت پیش کرنے کے لئے استعمال کرتے۔ اور اس دعوت کو قبول کرنے ہی نتیجے میں مقامی افراد نے اسلام قبول کیا۔ اور میں آپ کے سامنے ایک مسلمان کی حیثیت سے حاضر ہو سکا ہوں۔

سوال: ہم یہ دیکھتے ہیں کہ پیغمبر محمدؐ کی ولادت کے روز بہت بڑے بڑے جلوس نکلتے ہیں۔

جواب: یہ عمل بالکل درست نہیں۔ جو لوگ ایسا کرتے ہیں وہ اصل میں شیوجینتی، بھیم جینتی وغیرہ کی تقلید میں یہ جلوس نکالتے ہیں۔ یہ ایک کوتاہ تصور ہے۔ اسے آپ مسلم قوم پرستی سے بھی تعبیر کر سکتے ہیں۔ لیکن اسلام کہتا ہے کہ انسان کو قوم پرست نہیں خدا پرست ہونا چاہئے۔ قوم پرستی یہ ہے کہ میری قوم چاہے وہ حق پر ہو یا غلطی پر، میں ہمیشہ ان کی طرف داری کروں گا۔ یہی مسلم لیگ کا تصور بھی تھا۔ جبکہ اسلام کہتا ہے ساری انسانیت ایک ہے۔

قوم پرستی کے اس تصور کے خلاف میں لکھنے کی وجہ سے جماعت اسلامی کے بانی مولانا مودودیؒ کو لوگوں نے بہت تکالیف دیں۔ انہیں دو قومی نظریہ قبول نہیں تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ ہمارے لئے اسلام کی خدمت زیادہ اہم ہے۔ اگر ملک تقسیم ہو گیا تو لوگوں کو اسلام کو سمجھنے میں مزید دشواری پیدا ہوگی۔

اس لئے مسلمانوں میں جو چیزیں بعد میں پیدا ہوئی ہیں ان میں درگاہوں پر سروں کا ٹیکنا اور جلسے جلوس نکالنا ان تمام کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

سوال: ساری دنیا کا مالک اللہ ہے اور اسلام ہی اکیلا سچا مذہب ہے۔ اس سے متعلق آپ کا کیا کہنا ہے۔

جواب: ظاہر ہے یہ اسلام کا دعوہ ہے اور میرا اس پر پورا یقین ہے۔

سوال: بہت سے مذہبی علماء کا یہ کہنا ہے کہ ایک وقت ایسا آئے گا جب ساری دنیا میں صرف اسلام کا بول بالا رہے گا۔ ان کا یہ کہنا کیا قرآن کے مطابق ہے؟

جواب: قرآن نے یہ وعدہ کیا ہے کہ اگر تم نے سنجیدگی اور امانت داری کے ساتھ اللہ کے دین کی خدمت کی، تو تم پر آنے والی مصیبتیں اور مشکلات اللہ دور کرے گا۔ ہجرت سے قبل قریش نے نبی اکرمؐ کو قتل کرنے کے لئے ایک سازش رچی۔ مختلف قبیلوں کے سرداران نے رضا کارانہ طور پر ایک فرد اس قتل کو انجام دینے کے لئے بھیجا۔ لیکن ان کی آنکھوں کے سامنے سے وہ نکل گئے اور اللہ کا کرم ایسا کہ قاتل سمجھ بھی نہ پائے۔ اس پر بھی قریش چین سے نہیں بیٹھے۔ مدینہ انہوں نے چڑھائی کی۔ قرآن نے کہا کہ اگرچہ تمہاری تعداد کم ہے لیکن اللہ تمہاری مدد کو فرشتے بھیجنے والا ہے۔ ۱۰۰۰ کفار کے مقابلے میں ۳۱۳ مسلمان۔ مسلمانوں کے پاس ہتھیار بھی نہیں تھے۔ کھجور کی شاخوں اور لکڑیوں سے مقابلہ کرنے کو وہ نکلے۔ اس کے باوجود وہ فتح یاب ہوئے۔ یہ سب کچھ خدا کا فضل ہے۔ اس بات کو وہ بھی جانتے ہیں۔ اس اعتبار سے جب بھی مسلمان اپنے ایمان کے تقاضوں کو پورا کریں گے۔ تب اللہ ان کی مدد کرے گا۔ ایسا وعدہ اللہ کا ہے۔

ادارے کا تعارف

نالندہ یونیورسٹی: ماضی سے حال تک

اطلحہ منان

شمالی ہندوستان کے صوبہ بہار کے راجگیر علاقے میں واقع نالندہ یونیورسٹی ایک تحقیقی اور بین الاقوامی سطح پر مشہور یونیورسٹی ہے جسے ایسٹ ایشیا سمٹ میں حصہ لینے والے ممالک کی حمایت حاصل ہے۔ ۲۵ نومبر ۲۰۱۰ء کو ہندوستانی پارلیمنٹ کے ایک خصوصی ایکٹ کے ذریعہ یہ یونیورسٹی دوبارہ وجود میں آئی اور اسے "قومی اہمیت کا ادارہ" قرار دیا گیا۔ نالندہ اپنے ماضی میں ایک بہت بڑی اور زبردست تاریخ سمیٹے ہوئے ہے جس کی بنا پر یہ اپنے تمام شعبوں میں کمال تک پہنچنے اور اعلی تعلیم و تحقیق کے معیار کو بہتر بنانے کے لئے خواہاں ہے۔ اس یونیورسٹی کے تجویز کردہ بین الحکومتی میمورنڈم پر تقریباً سترہ ممالک نے دستخط کئے ہیں۔ اب یہ یونیورسٹی دنیا کے ساتھ اپنے کھوئے ہوئے تعلقات اور شراکت داروں کو جو ایشیا میں موجود ہیں، واپس پانا چاہتی ہے۔

قدیم ہندوستان کی تاریخ پر غور کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ نالندہ اس دور میں اعلی تعلیم کا سب سے اہم اور مشہور مرکز تھا۔ اسے گپت سلطنت کے ایک مشہور حکمراں کمار گپت نے قائم کیا تھا۔ اس ادارے کی فلاح و بہبود کے لئے کمار گپت کے بعد آنے والے حکمرانوں کی طرف سے بھی پوری مدد کی گئی اور اتنا ہی نہیں بلکہ کمار سلطنت کے زوال کے بعد بھی آنے والی سلطنتوں اور شاہی خاندانوں نے اس ادارے کو دی جانے والی امداد جاری رکھی۔ بدھ مت کے ماننے والے عظیم حکمراں ہرش وردھن نے اس ادارے کے تحفظ کے لئے کافی کام کیا۔ اس کے علاوہ اس ادارے کو غیر ملکی حکمرانوں سے بھی امداد ملتی رہتی تھی۔ بدھ مت کے طلبہ کے علاوہ دیگر مذاہب و ممالک کے طلبہ یہاں تعلیم حاصل کرنے آتے تھے۔ ہندوستان کی موجودہ بہار ریاست کی راجدھانی پٹنہ سے ۸۸ کلومیٹر دور راجگیر علاقے میں مشہور مؤرخ الیگزینڈر نے اس ادارے کے جو باقی ماندہ نشانات دریافت کیے ہیں، ان سے اس ادارے کی عظمت و وقار کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ دیگر تاریخی کتبوں، کتابوں اور ساتویں صدی میں ہندوستان آنے والے چینی سیاح ہنس آنگ کے سفر ناموں سے اس ادارے کے بارے میں کافی معلومات حاصل ہوتی ہے۔ ایک اندازے کے مطابق اس وقت یہاں تقریباً دس ہزار طلبہ اور دو ہزار اساتذہ ہوا کرتے تھے۔ خود چینی سیاح ہنس آنگ نے ساتویں صدی عیسوی میں اپنی زندگی کے دو سال یہاں طالب علم اور استاد کے طور پر گزارے ہیں۔ انہوں نے اپنے سفر ناموں میں نالندہ کے بارے میں بہت کچھ لکھا ہے۔ ہنس آنگ نے لکھا ہے کہ ہزاروں طالب علم نالندہ میں تعلیم حاصل کرتے تھے اور اسی وجہ سے نالندہ مشہور تھا۔ ہمارا پورا دن مطالعہ میں گزر جاتا تھا، اگر یہاں کسی رائے پر اختلاف ہوتا تو کسی کو اپنی بات منوانے کے لئے مجبور نہیں کیا جاتا تھا۔ کسی طالب علم کو مارا پیٹا نہیں جاتا تھا۔ غیر ملکی طلبہ بھی یہاں تعلیم حاصل کرنے کے لئے آتے تھے۔ آسُنگ نامی چینی مؤرخ نے لکھا ہے کہ یونیورسٹی کے مشہور علماء کرام کے نام یونیورسٹی کے مرکزی دروازے پر جلی حروف میں لکھے

جاتے تھے۔ نالندہ کی شہرت کی وجوہات میں ایک وجہ یہ بھی بتائی جاتی ہے کہ گوتم بدھ کے سب سے فرمابردار طالب علم 'ساری پتر' نے یہاں تعلیم حاصل کی تھی اور آگے چل کر بدھ مت کے بہت بڑے عالم بنے تھے۔ ان کی شہرت کے بارے میں جان کر خود اس وقت کا حکمراں اشوک ان سے ملنے آیا تھا اور نالندہ کو کافی مالی امداد دے کر گیا تھا۔

یہ دنیا کی پہلی مکمل طور پر رہائشی یونیورسٹی تھی جہاں تعلیم حاصل کرنے کے لئے ہندوستان کے مختلف علاقوں سے ہی نہیں بلکہ دیگر ممالک مثلاً کوریا، جاپان، چین، انڈونیشیا، فارس اور ترکی وغیرہ سے طلبہ آتے تھے۔ نالندہ کے کچھ مخصوص تعلیم یافتہ گریجویٹ اپنی تعلیم پوری کرنے کے بعد پوری دنیا کے مختلف علاقوں میں جا کر بدھ مت کی تعلیمات کو عام کرتے تھے۔ اسی لئے اس یونیورسٹی کو نویں صدی سے بارہویں صدی تک بین الاقوامی سطح پر خوب شہرت حاصل ہوئی۔

انتہائی منظم اور وسیع علاقے میں واقع اس یونیورسٹی کا کیمپس فن تعمیر کا ایک حیرت انگیز نمونہ تھا۔ مکمل کیمپس ایک بڑی اور پختہ دیوار سے گھرا ہوا تھا جس میں داخلے کے لئے ایک مرکزی دروازہ تھا۔ شمال سے جنوب کی جانب مٹھوں کی قطاریں تھیں جن کے سامنے خوبصورت عبادت گاہیں بنی ہوئی تھیں۔ مرکزی اسکول میں سات بڑے کمرے اور تین سو دیگر کمرے تھے جہاں لیکچرز ہوا کرتے تھے۔ ابھی تک کھدائی کے دوران تیرہ مٹھ دریافت ہوئے ہیں۔ ایک مٹھ ایک سے زائد منزلوں پر مشتمل ہوتا تھا جہاں طلبہ کی رہائش کا پورا انتظام کیا گیا تھا۔ ہر مٹھ میں ایک کنواں، آٹھ بڑے کمرے جو کہ لیکچرز کے لئے مخصوص تھے، ایک عبادت گاہ اور باغیچہ بھی تھا۔

پوری یونیورسٹی کا ناظم آچاریہ 'یا وائس چانسلر ہوتا تھا، جسے اس وقت کے کچھ مشہور راہبوں کی جانب سے منتخب کیا جاتا تھا۔ آچاریہ دو مشاورتی کمیٹیوں کے مشوروں سے سارے انتظامات کرتا تھا۔ پہلی کمیٹی تعلیم اور نصاب سے جڑے مسائل دیکھتی تھی اور دوسری کمیٹی مالیاتی نظام و دیگر نظم و ضبط کے معاملات پر نظر رکھتی تھی۔ یہ کمیٹی یونیورسٹی کو عطیہ کردہ دو سو گاؤں سے ہونے والی پیداوار اور آمدنی کی نگرانی بھی کرتی تھی۔ اسی آمدنی سے ہزاروں طلبہ کے لیے خوراک، لباس اور رہائش کے انتظامات ہوتے تھے۔ یونیورسٹی میں تین قسم کے اساتذہ درس و تدریس کے فرائض انجام دیتے تھے جو کہ اپنی قابلیت کے اعتبار سے پہلے، دوسرے اور تیسرے زمرے میں آتے تھے۔ نالندہ کے مشہور اساتذہ میں شیل بھدر، دھرم پال، چندر پال، گنُمتی وغیرہ تھے۔ ساتویں صدی میں جب چینی سیاح ہن سانگ یہاں آیا تھا، اس وقت یہاں کے وائس چانسلر شیل بھدر تھے جو کہ اس وقت ایک عظیم استاد اور عالم کی حیثیت رکھتے تھے۔ ایک قدیم روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ ریاضی کے مشہور دانشور آریا بھٹ بھی اس یونیورسٹی کے وائس چانسلر رہے تھے۔ آچاریہ طلبہ کو زبانی لیکچرز کے ذریعے سکھاتے تھے۔ اس کے علاوہ، کتابوں کی تشریح بھی کی جاتی تھی، درس و تدریس کی کلاسز عام طور پر دن میں ہوتی تھیں اور دن کے آخری پہر میں ہر روز، مطالعہ کے ساتھ ساتھ طلبہ کی شکایتوں کو سنا جاتا تھا اور ہر ممکن حل کرنے کی کوشش کی جاتی تھی۔ یہاں ناگارجن، وسوبندھو، آسنگ اور دھرماکیرتی کی کتابوں کا تفصیلی مطالعہ ہوتا تھا۔ وید، ویدانت بھی پڑھائے جاتے تھے۔ گرامر، فلسفہ، علم جراحت، علم نجوم، یوگا اور طب بھی نصاب کے تحت موجود تھے۔ کچھ دانشوران کا خیال ہے کہ نالندہ کی کھدائی میں پائے گئے بہت سے مجسموں کی بنیاد پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہاں دھات کے مجسمے بنانے کی سائنس کا مطالعہ بھی کیا جاتا ہوگا۔۔ یہاں علم نجوم کے مطالعہ کے لئے ایک خصوصی شعبہ بھی قائم تھا۔

داخلہ کے لیے اہلیتی امتحان بہت مشکل ہوتا تھا جس کی وجہ سے یونیورسٹی میں باصلاحیت طالب علم ہی داخلہ لے سکتے تھے۔ داخلہ کے لئے انہیں تین مشکل ٹیسٹ میں کامیاب ہونا ضروری تھا۔ اچھے اخلاق کا ہونا اور یونیورسٹی کے قوانین کی پابندی کرنا داخلہ کے بنیادی شرائط میں شامل تھا۔ شروع میں طالب علم یہاں صرف اعلی تعلیم حاصل کرنے آتے تھے لیکن بعد میں یہاں ابتدائی اور ثانوی درجات کی تعلیم کا بھی اچھا انتظام ہو گیا تھا۔

نالندہ یونیورسٹی میں ہزاروں طلبہ اور اساتذہ کے مطالعہ کے لئے ایک نو منزلہ لائبریری تھی جس میں تین ملین سے زائد کتابوں کا مجموعہ تھا۔ اس لائبریری میں تمام موضوعات سے متعلق کتابیں تھیں۔ یہ لائبریری تین بڑی عمارتوں پر مشتمل تھی جن میں پہلی 'رتن رنجک' دوسری 'رتنودھی' اور تیسری 'رتن ساگر' کے نام سے جانی جاتی تھی۔ 'رتنودھی' لائبریری میں ہاتھ سے لکھی گئی کتابوں کا بہت بڑا ذخیرہ تھا۔ ان میں سے کئی کتابوں کی کاپیاں چینی سیاح اپنے ساتھ لے گئے تھے۔

طلبہ کی رہائش کے لئے تین سو سے زائد کمرے تھے جن میں ایک یا ایک سے زائد طلبہ کے رہنے کا انتظام کیا گیا تھا۔ طلبہ کو ہر سال ان کی کارکردگی کے مطابق کمرہ دیا جاتا تھا۔ اس کا نظم و نسق خود طلبہ کے ذریعہ اپنی طلبہ یونین کی رہنمائی میں کیا جاتا تھا۔ یہاں طلبہ کی خود اپنی یونین موجود تھی۔ وہ اپنی یونین کے انتظامات اور انتخابات خود ہی کرتے تھے۔ طلبہ یونین طلبہ کے مختلف مسائل مثلاً رہائش اور کھانے کا اچھا انتظام وغیرہ پر نظر رکھتی تھی۔ طلبہ کو کوئی مالی فکر نہیں تھی۔ تعلیم، خوراک، کپڑے، ادویات اور علاج ان کے لئے مفت تھے۔ ریاست کی طرف سے دو سو گاؤں بطور عطیہ موصول ہوئے تھے، جن کے کھیتوں کی پیداوار اور اناج سے یونیورسٹی کے اخراجات پورے کئے جاتے تھے۔

تیرہویں صدی تک اس یونیورسٹی کا وجود مکمل طور پر ختم ہو گیا۔ مسلم مؤرخ منہاج اور تبتی مؤرخ تارا ناتھ کے اکاؤنٹس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ یونیورسٹی ترکوں کے حملوں کی وجہ سے تباہ ہوگئی۔ تارا ناتھ کے مطابق آچاریوں اور راہبوں کے آپسی تنازعات نے بھی اس یونیورسٹی کے وقار کو بہت زیادہ نقصان پہنچایا۔ اس یونیورسٹی پر پہلا حملہ ہڑ حکمراں مہر کل نے کیا تھا۔ ۱۱۹۹ عیسوی میں ترک حکمراں بختیار خلجی نے اس یونیورسٹی پر حملہ کیا اور اسے جلا کر پوری طرح تباہ کر دیا۔ تاریخ میں آتا ہے کہ نالندہ کی عظیم الشان لائبریری کئی مہینوں تک جلتی رہی۔ مؤرخین لکھتے ہیں کہ اگر اس یونیورسٹی کو تباہ نہ کیا جاتا تو آج یہ دنیا کی سب سے قدیم ترین یونیورسٹیوں، اٹلی کی بولونا (۱۰۸۸ء)، برطانیہ کی آکسفورڈ (۱۱۶۷ء) اور قاہرہ کی الاظہر (۹۷۲ء) سے بھی قدیم یونیورسٹی ہوتی۔

اس وقت یونیورسٹی کے باقیات چودہ ہیکٹر کے علاقے میں موجود ہیں۔ کھدائی میں دریافت تمام عمارتوں کو سرخ پتھر سے بنایا گیا ہے۔ یہ کیمپس جنوب سے شمال کی جانب بنا ہوا ہے۔ مٹھ یا وہار اس کیمپس کی مشرقی اور مندر مغربی سمت میں ہیں۔ اس یونیورسٹی کیمپس کی سب سے اعلیٰ عمارت 'وہار' تھی جس کی دو منزلہ عمارت آج بھی یہاں باقی ہے۔ مؤرخین مانتے ہیں کہ شاید اساتذہ اپنے طلبہ کو یہاں سے خطاب کرتے ہوں گے۔ اس وہار میں ایک چھوٹی سی عبادت گاہ بھی محفوظ حالت میں موجود ہے جس میں بدھ کی مورت کو رکھا گیا ہے۔ یہی مندر اس کیمپس کا سب سے بڑا مندر ہے۔ اس مندر کی خاصیت یہ ہے کہ اس کی چھت سے پورے علاقے کا ایک نظر میں جائزہ لیا جاسکتا ہے۔ یہ مندر بدھ کی کئی چھوٹی مورتیوں سے گھرا ہوا ہے۔

چونکہ نالندہ تعلیم و علوم سائنس کا قدیم ترین مرکز رہا ہے اسی لئے انٹرنیشنل آرگنائزیشن یونیسکو کی جانب سے اسے کبھی بھی عالمی ثقافتی ورثہ قرار دیا جاسکتا ہے۔ اس سلسلے میں ہندوستان

کی جانب سے یونیسکو کو سفارش بھیج دی گئی ہے۔ ہندوستان کے شعبہ آثار قدیمہ نے اسے محفوظ ثقافتی ورثہ قرار دیا ہے اور اس جگہ کی اس کی اصل بناوٹی طرز پر مرمت کرائی گئی ہے۔ یہ کوشش کی گئی ہے کہ اس کی اصل شکل میں تبدیلی نہ آسکے۔

نالندہ یونیورسٹی میں فی الحال تین اسکول چل رہے ہیں جو طلبہ کے لئے مختلف کورسز فراہم کرتے ہیں۔ یہ اسکول طلبہ کو ہر طرح کے ماحول میں سیکھنے پر زور دیتے ہیں تاکہ وہ حقیقی مسائل کو جان کر ان کا بہتر حل دنیا کے سامنے پیش کر سکیں۔ ان اسکولوں میں تاریخی مطالعات، علم الموسمیات و ماحولیات اور فلسفہ بدھ مت اور موازنہ بین المذاہب کے اسکول شامل ہیں۔ ان سبھی اسکولوں میں طلبہ کا پہلا بیچ ۲۰۱۴ء میں شروع ہوا تھا۔ مستقبل میں نالندہ پانچ مزید سکولوں کی تعمیر کرنے کا ارادہ رکھتی ہے، جن میں لسانیات اور ادبیات، بین الاقوامی تعلقات اور مطالعہ امن، انفارمیشن سائنس اور ٹیکنالوجی، معاشیات اور مینیجمنٹ و عوامی صحت کے اسکول شامل ہوں گے۔ ان تینوں اسکولوں میں یونیورسٹی پوسٹ گریجویشن کورسز یعنی ماسٹرز پروگرام فراہم کر رہی ہے۔ یہ اسکول تمام پروگراموں کے ذریعے باہمی یونیورسٹیوں اور اداروں کے طلبہ اور فیکلٹی ممبران کے ساتھ تعاون پر مبنی تحقیق، بیرون ملک تجربات کا مطالعہ، اور غیر ملکی زبان کی تربیت پر زور دیتے ہیں۔ طلبہ سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ بین الجامعات تحقیق پر زور دیں، اپنی پسند کے مطابق اسکول اور پروگرام کو منتخب کریں اور اپنی تحقیقی صلاحیتوں کو پروان چڑھائیں تاکہ وہ دنیا میں موجود پریشانیوں کا بہتر حل پیش کر سکیں۔

اسکول آف ہسٹورکل اسٹڈیز (تاریخی مطالعات): یہ اسکول فیکلٹی کے اراکین اور گریجویٹ طلبہ کی ایک متحرک کمیونٹی ہے۔ یہاں طالب علم ایشیائی و غیر ایشیائی ممالک کی ثقافتی و سیاسی، معاشی، زبانی و بصری آرٹس اور مذہبی تاریخ کے اہم پہلوؤں پر ریسرچ کرتے ہیں۔ اسکول طلبہ کے لئے پوسٹ گریجویشن ڈگری کورس یعنی ایم اے چلا رہا ہے جس میں طلبہ عالمی اور موازناتی تاریخ کا مطالعہ کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ یہ بین الاقوامی سطح پر ایشیائی اور عالمی تاریخ کے متعلق ایک مسابقتی پروگرام بھی چلاتا ہے۔ فی الحال نالندہ یونیورسٹی دوسرے اسکولوں اور تاریخی مطالعات کے طلبہ کے ساتھ مل کر زندہ آرکائیو یا محفوظ شدہ دستاویز (Living Archive) کی تعمیر پر کام کر رہی ہے۔ اس کے ذریعہ تاریخی اہمیت کی چیزوں کو تمام شکلوں مثلاً زبانی، بصری اور متنی وغیرہ میں دیکھا جا سکے گا۔ یہ آرکائیو صرف شناختی تحقیق اور تدریس کے علاقوں سے متعلقہ مواد جمع نہیں کرے گا بلکہ مقامی کمیونٹی کے تاریخ میں دلچسپی رکھنے والے افراد کے، مقامی سائٹس کے ساتھ تعلقات بھی پیدا کرے گا۔ ان آرکائیو کو آنلائن ہوسٹ کرنے کے بعد یہ صرف نالندہ یونیورسٹی کے طلبہ کو ہی نہیں بلکہ ہندوستان کے سبھی طلبہ کو تاریخ کے میدان میں ریسرچ کے وسائل فراہم کرے گا۔

اسکول آف ایکولوجی اینڈ انوارمینٹل اسٹڈیز (علم موسمیات و ماحولیات): یہ اسکول ہیومن ایکولوجی، ہائیڈرولوجی، ڈیزاسٹر مینجمنٹ، فوڈ اینڈ ایگریکلچر، موسمیاتی تبدیلی، اور انرجی اسٹڈیز جیسے موضوعات پر مختلف پروگرام چلاتا ہے۔ نالندہ یونیورسٹی کی ویب سائٹ پر ایک خوبصورت دعویٰ کیا گیا ہے کہ یہ یونیورسٹی ایک ''زندہ لیبارٹی'' ہے جس میں جغرافیائی، ماحولیاتی اور موسمیاتی علوم میں تحقیق کر کے طلبہ کو اس کا فائدہ اٹھانا چاہئے۔ اس وقت اس اسکول میں بڑے پیمانے پر زبردست تحقیقات چل رہی ہیں، جن میں سے کچھ یہ ہیں۔

1.Transport and retention of engineered nanoparticles in porous media.

2.Transport and leakage of CO_2gas through heterogeneous subsurface system.

3.Groundwater mapping and well-logging of shallow aquifers.

4.Changing Irrigation Practices and Emerging Sustainability Challenges in South Bihar.

5.Physical and cultural environment of Eastern Himalayas.

فی الحال یہ اسکول دو سال کا پوسٹ گریجویشن کورس (ایم اے اور ایم ایس سی) چلا رہا ہے۔ کورس کے آخری یعنی دوسرے سال کے اختتام پر طلبہ کو کسی موضوع پر ریسرچ کرنے کے بعد تحقیقی مقالہ پیش کرنا ہوتا ہے جس کے بعد انہیں ڈگری فراہم کی جاتی ہے۔

اسکول آف بدھسٹ اسٹڈیز، فلاسفی اینڈ کمپیرٹو ریلجن (فلسفہ بدھ مت اور موازنہ بین المذاہب): یہ اسکول بدھ مت کی تہذیب، فلسفہ اور تاریخ کی تعلیم فراہم کرتا ہے۔ اس کے علاوہ بدھ مت کے ساتھ دیگر مذاہب کا موازنہ کر کے طلبہ کے اندر تنقیدی تجزیہ کرنے کا فہم پیدا کرتا ہے۔ اسکول قدیم زبانوں کے استعمال پر زور دیتا ہے اور طلبہ کو کم سے کم ایک کلاسیکی بدھ زبان (سنسکرت، پالی، تبتی) یا کسی دیگر زبان کا مطالعہ کرنا ضروری قرار دیتا ہے تاکہ وہ بدھ مت کے قدیم دستاویز اور مذہبی کتابیں پڑھنے کے قابل بن سکیں۔ اس وقت یہ اسکول طلبہ کے لئے ایک پوسٹ گریجویشن پروگرام (ایم اے) چلا رہا ہے۔

نالندہ یونیورسٹی اپنے ہونہار طلبہ، مالی اعتبار سے کمزور طلبہ اور غیر ملکی طلبہ کے لئے مختلف اسکالرشپ پروگرام بھی چلا رہی ہے۔ جن میں سے کچھ اسکالرشپ ان کی صلاحیتوں کو دیکھ کر دی جاتی ہیں اور کچھ اسکالرشپ کے لئے انہیں باقاعدہ کسی پروجیکٹ وغیرہ پر کام کرنا ہوتا ہے۔ اگر آپ ان تینوں اسکولوں میں سے کسی بھی اسکول میں پوسٹ گریجویشن کی ڈگری حاصل کرنا چاہتے ہیں تو آپ با آسانی نالندہ یونیورسٹی میں داخلہ لے سکتے ہیں۔ داخلے کا طریقہ کار بہت آسان ہے۔ آنلائن داخلہ فارم بھرنے کے بعد طلبہ کو دو مرحلوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ پہلے مرحلے میں طلبہ کے گزشتہ تعلیمی کارکردگی کی بنیاد پر چنندہ افراد کی فہرست جاری کی جاتی ہے۔ اس کے بعد ان افراد کو انٹرویو میں ان کی پرفارمنس کی بنیاد پر داخلہ دیا جاتا ہے۔

داخلے سے متعلق مزید معلومات کے لئے طلبہ مندرجہ ذیل ایڈریس پر ای میل کر سکتے ہیں۔

admissions@nalandauniv.edu.in

اس کے علاوہ دیگر معلومات کے لئے یونیورسٹی کی ویب سائٹ nalandauniv.edu.in پر جا سکتے ہیں۔

کیمپس میں تعصب کے مظاہر

منظر اور پس منظر

| ذیشان امجد حاتم

پچھلے ڈیڑھ دو سال سے مختلف یونیورسٹیز میں خصوصاً Central Universities میں افراتفری کا ماحول ہے۔ آئے دن یونیورسٹیز میں طلباء کے غائب ہونے کے واقعات، طلباء سے مار پیٹ، طلباء و طالبات پر لاٹھی چارج، طالبات کے ساتھ چھیڑ چھاڑ، طلباء پر بنا کسی وجہ اور ٹھوس ثبوت کے ملک مخالف ہونے کا الزام لگانا اور ان کی گرفتاریاں عام ہو چکی ہیں۔ یوں تو کیمپس میں اس طرح کے واقعات پہلے بھی رونما ہوتے رہے ہیں مگر پچھلے چند سالوں کے اندر ان واقعات میں تیزی سے اضافہ ہوا ہے۔ ملک کی کئی بڑی یونیورسٹیز جیسے حیدرآباد یونیورسٹی، دہلی یونیورسٹی، جواہر لعل نہرو یونیورسٹی، جامعہ ملیہ اسلامیہ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، بنارس ہندو یونیورسٹی و دیگر مظالم کے زد میں آئی ہیں۔

چند معروف واقعات: ہمیں معلوم ہے حیدرآباد یونیورسٹی میں پی ایچ ڈی کے طالب علم اور ایک کتاب Cast is not rumour کے مصنف روہت ویمولا نے ۱۷ر جنوری ۲۰۱۶ء کو خودکشی کر لی۔ جولائی ۲۰۱۵ء میں یونیورسٹی نے اسے ماہانہ ۲۵۰۰۰ روپے فیلوشپ دینے سے ہاتھ کھینچ لیے تھے۔ اس کے بعد روہت ویمولا نے قانون کے دائرے میں رہتے ہوئے احتجاج کیا جس کے نتیجے میں اسے اے بی وی پی جیسی بھگوا تنظیم کی دھمکیوں کا سامنا کرنا پڑا اور آخر کار خودکشی کرنی پڑی۔ حالانکہ یہ بھی اب تک ایک معمہ ہے کہ اس نے خودکشی کی یا اسے مار دیا گیا۔ یہ بات ذہن نشین رہے کہ بی ایچ یو کی طالبات کے ساتھ ۲۱ ستمبر کو بھارت کلا بھون کے پاس چھیڑ چھاڑ کی گئی جس کی وجہ سے طالبات میں غصہ پھوٹ پڑا اور وہ تریوینی ہاسٹل سے سڑک پر آ گئیں۔ ان تمام واقعات پر غور کیا جائے تو ایک بات تو صاف ہے کہ یونیورسٹیز کے ماحول کو منصوبہ بند طریقے سے متاثر کیا جا رہا ہے اور تعلیمی نظم و نسق بھی ان واقعات سے بری طرح متاثر ہوا ہے۔ کیا یونیورسٹیز غنڈہ گردی کے اڈوں میں تبدیل ہو رہی ہیں؟ آخر کیا وجوہات ہیں کہ کیمپس میں مظالم کے مظاہر آئے دن دیکھنے کو ملتے ہیں۔

اس وقت ملک کا نظام فسطائی طاقتوں کے ہاتھوں میں ہے۔ یہ فسطائی طاقتیں ہر شعبہ کا بھگواکرن کرنا چاہتی ہیں اور انھیں یہ اچھی طرح معلوم ہے کہ سب سے پہلے تعلیم و تربیت میں بھگوا رنگ داخل کرنا ہے کیونکہ اسی کے ذریعے ان کے آگے کے تمام منصوبے کامیاب ہوں گے اور اس کام کے خلاف جو کوئی بھی کھڑا ہو، سیاسی طاقت کے زور پر اسے کچل دیا جائے۔ وجہ صاف ہے کہ یہ فسطائی طاقتیں یہ نہیں چاہتی ہیں کہ دلت لڑکے لڑکیاں بھی تعلیم حاصل کریں اور آگے بڑھیں کیونکہ ایسی صورت میں دلت بھی اپنے حقوق اور بہتر طریقے سے سمجھ سکیں گے اور حکومتوں سے اپنے حقوق طلب کریں گے۔ ایسی صورت میں فسطائی طاقتیں کمزور پڑ جائیں گی۔

ان فسطائی طاقتوں کو مسلمانوں کے آگے بڑھنے سے سب سے زیادہ خطرہ ہے کہ کہیں آگے چل کر یہ مسلمان شرعِ پیغمبرؐ آشکار نہ کر دیں۔ اسی طرح جے این یو میں بھی جو کچھ ہوا ہے، اس سے ہم سب واقف ہیں۔ نجیب کا غائب ہونا، طلباء کا اس کے لیے احتجاج کرنا اور پھر اس کے عوض جیل جانا۔ یہ سب کچھ ہم لوگوں نے دیکھا اور سنا اور یہاں بھی بھگوا دہشت گردی کا ننگا ناچ صاف طور پر دیکھنے کو ملا۔

پھر چند دن بعد جامعہ ملیہ اسلامیہ کے بوائز ہاسٹل میں چند انجان لوگوں کا داخل ہونا اور ویڈیو گرافی کرنا اور پوچھے جانے پر خود کو انٹلی جینس آفیسرز بتانا۔ پچھلے دو سال کے اندر ملک بھر میں ایسے کئی واقعات ہوئے ہیں۔ ڈی یو میں بھی احتجاج کر رہے اے آئی ایس ایف کے طلباء سے اے بی وی پی کے طلباء نے زبردست مار پیٹ کی جس میں طالبات کو بھی نہیں بخشا گیا اور کنول پریت کور کو ریپ کی دھمکیاں بھی دی گئیں۔ ابھی حالیہ دنوں میں بی ایچ یو کا معاملہ سامنے آیا۔ بعض خبروں کے مطابق بی ایچ یو کی طالبات چھیڑ چھاڑ کی مخالف میں دھرنا دے رہی تھیں اور صرف اس وجہ سے ان پر زبردست لاٹھی چارج ہوا۔ جس دن یہ واقعہ پیش آیا، بجائے اس کے کہ ضلع انتظامیہ اس پر کچھ کارروائی کرنے کے اگلے دن تک ضلع کے تمام بڑے تعلیمی اداروں کو بند رکھنے کا تغلقی فرمان جاری کر دیا، اگلے ہی دن پولیس فورس یونیورسٹی کیمپس میں گشت کرتی رہی تاکہ ڈر کا ماحول بنایا جا سکے۔ اس کے باوجود بی ایچ یو کے طلباء و طالبات نے وی سی ہاؤس کے اردگرد احتجاج کیا مگر وی سی کے کانوں پر جوں نہیں رینگی۔

ان تمام وجوہات کو سامنے رکھ کر موجودہ وقت میں ان پریشانیوں کا حل ہر کوئی سوچ رہا ہے مگر سوال یہ اٹھتا ہے کہ دقتیں کہاں آ رہی ہیں اور کیا چیلنجز اس وقت ہمارے سامنے ہیں؟

ہماری ذمہ داری: اس وقت سب سے بڑا چیلنج یہ ہے کہ میڈیا جو لوگوں کے ذہنوں میں جھوٹ اور فریب کے بیج بو رہا ہے اور عوام کو غلط فہمیوں میں مبتلا کر رہا ہے، اس پر کس طرح قابو پایا جائے یا اس کام کو کیسے روکا جائے؟ یہ غور و فکر کا مقام ہے۔

یونیورسٹی کیمپس کا ماحول اگر کوئی خراب کر رہا ہے تو کچھ لوگ تو ایسے ضرور ہونے چاہئیں کہ ماحول کو بگڑنے سے روکیں اور کیمپس میں اچھائی کو عام کریں اور مسلمان طلباء پر تو یہ فرض بنتا ہے کہ کیمپس میں اس کا کردار بالکل صاف و شفاف ہو اور جداگانہ ہو۔ اس نقطہ پر بھی غور و فکر کی ضرورت ہے۔ دلت طلباء و طالبات کے ساتھ ہو رہے بھید بھاؤ اور ظلم و زیادتی کے لیے ہر یونیورسٹی میں ایک اسپیشل سیل کی ضرورت ہے جو خصوصاً دلت طلبا و طالبات کے مسئلے کو سنے سمجھے اور اس کا حل پیش کرے۔ اسی طرح سے اقلیتی طلباء و طالبات کے لیے بھی ایک اسی طرح کے ''اسپیشل سیل'' کی ضرورت آج کے اس ماحول میں ہے۔

2017 کے نوبل انعامات

عبدالباری مومن۔ بھیونڈی

ڈائنامائیٹ کے موجد الفریڈ نوبل کی وصیت کے مطابق چند شعبوں میں ان کی دولت سے دیئے جانے والے انعامات کا شمار دنیا کے سب سے بڑے اعزازات میں ہوتا ہے، جس کا سلسلہ ۱۹۰۱ء سے جاری ہے۔ نوبل کمیٹی کے ذریعے منتخب کئے گئے سال رواں ۲۰۱۷ء کے انعام یافتگان کا مختصر تعارف پیش ہے۔

طبعیات (فزکس): 2017 کا طبعیات کا نوبل پرائز تین سائنس دانوں میں اس طرح تقسیم کیا گیا ہے کہ **رینر ویز** (Rainer Weiss) نام کے سائنس داں کو انعام کا نصف حصہ تفویض کیا گیا اور بقیہ نصف حصہ دو سائنس دانوں کو برابر برابر یعنی ہر ایک کو ایک چوتھائی دیا گیا۔ ان دونوں سائنس دانوں کے نام ہیں، Barry C. Barish اور Kip S. Thorne۔ یہ انعام ان کو LIGO detector پر ایک فیصلہ کن تحقیق کے لیے دیا گیا ہے۔ L I G O کا پورا مطلب ہے Laser Interferometer Gravitational-wave Observatory ۔ یہ دراصل امریکہ میں ایک بہت بڑی رصدگاہ ہے جو آئن اسٹائن کی پیش کردہ کشش ثقل کی لہروں (Gravitational Waves) کے نظریہ پر لیزر کے ذریعے تحقیقات کے لیے قائم کی گئی ہے۔ اس تحقیق کے ذریعے یہ معلوم کرنے کی کوشش کی جارہی ہے کہ کیا کشش ثقل کی ان لہروں سے آسمانی فضاؤں میں کوئی کام لیا جاسکتا ہے۔

فزکس کے نوبل انعام میں نصف حصہ کے مستحق قرار دیے گئے سائنس داں **رینر ویز** برلن (جرمنی) میں 1932 میں پیدا ہوئے تھے۔ انعام کے مستحق قرار پانے کے وقت وہ کیمبرج کے Masschusetts Institute of Technology جسے عام طور پر MIT کے نام سے پہچانا جاتا ہے، سے منسلک تھے، جہاں وہ ایک ایسے Collaboration پر کام کررہے تھے جو LIGO اور Virgo کے اشتراک سے جاری ہے۔ Virgo نام کا یہ ادارہ، جو بالکل LIGO کے طرز پر کام کررہا ہے، اٹلی میں واقع ہے۔ بقیہ دو انعام یافتگان، یعنی Barry C. Barish اور Kip S. Thorne بھی اسی موضوع پر اور مذکورہ بالا دو اداروں کے اشتراک سے کی جانے والی تحقیق پر امریکہ کے ایک دوسرے ادارے کیلی فورنیا انسٹی ٹیوٹ آف ٹیکنالوجی میں کام کررہے تھے۔ Barry C. Barish کی پیدائش 1936 میں اوہاما (امریکہ) اور Kip S. Thorne کی پیدائش 1940 میں لوگان (امریکہ) میں ہوئی تھی۔

کیمیات (کیمسٹری): 2017 کا کیمسٹری کا نوبل پرائز تین سائنس دانوں میں برابر تقسیم کیا گیا ہے۔ ان کے نام ہیں Jacques Dubochet، Joachim Frank اور Richard Handerson ۔ ان سائنس دانوں کو یہ اعزاز بائیو مالیکیول پر ان کی ایک نئی تحقیق کے سلسلے میں دیا گیا ہے۔ ان میں سے پہلے سائنس داں یعنی Jacques Dubochet کی پیدائش 1942 میں سوئزرلینڈ میں ہوئی۔ انعام کے حصول کے وقت وہ سوئزرلینڈ کی لاؤسانے یونیورسیٹی سے منسلک تھے۔ دوسرے انعام یافتہ Joachim Frank کی پیدائش 1940 میں Siegen جرمنی میں ہوئی۔ انعام کے حصول کے وقت وہ نیویارک، امریکہ کی کولمبیا یونیورسیٹی سے منسلک تھے۔ تیسرے انعام یافتہ Richard Handerson کی پیدائش 1945 میں اسکاٹ لینڈ کی ایڈمبرگ میں ہوئی۔ انعام کے حصول کے وقت وہ کیمبرج کی ایم آرسی لیباریٹری آف مولیکیولر بائیلوجی سے منسلک تھے۔

میڈیسن: 2017 کا فزیالوجی یا میڈیسن کا نوبل پرائز بھی تین سائنس دانوں میں برابر تقسیم کیا گیا ہے۔ ان کے نام ہیں۔ جیفری سی ہال (Jeffrey C. Hall) مائیکل روزبیش (Michael Rosbash) اور Michael W. Young۔ ان سائنس دانوں کو یہ اعزاز مالیکولر میکانزم کی اس دریافت کے سلسلے میں دیا گیا ہے جو علم حیاتیات کے لحاظ سے فطری اور تواتر کے ساتھ وقوع پذیر ہونے والی تال (rhythm) پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ ان میں سے پہلے سائنس داں یعنی جیفری سی ہال کی پیدائش 1945 میں نیویارک میں ہوئی۔ انعام کے حصول کے وقت وہ امریکہ کی Maine یونی ورسٹی سے منسلک تھے۔ دوسرے انعام یافتہ مائیکل روزبیش کی پیدائش 1944 میں کنساس سٹی، امریکہ میں ہوئی۔ انعام کے حصول کے وقت وہ امریکہ کی Brandeis یونیورسٹی کے Howard Hughes Medical Institute سے منسلک تھے۔ تیسرے انعام یافتہ Michael W. Young کی پیدائش 1949 میں میامی، امریکہ میں ہوئی۔ انعام کے حصول کے وقت وہ راک فیلر یونی ورسٹی، نیویارک، امریکہ سے منسلک تھے۔

ادب: 2017 کا ادب (Literature) کا نوبل پرائز Kazuo Ishiguro کو دیا گیا۔ جوناگاساکی جاپان میں 1954 میں پیدا ہوئے تھے، اگرچہ وہ برطانیہ میں پلے بڑھے۔ یہ انعام ان اس بات کے لیے دیا گیا ہے کہ انھوں نے اپنے ناولوں کے ذریعے جذبات کی زبردست قوت اور اس دنیائے فانی سے ہمارے خیالی اور تصوراتی احساسات کی گہرائی کا اظہار کیا ہے۔ ان کے ناول ''**آن کنسولڈ**'' کو طلسمی حقیقت نگاری سے تعبیر کیا گیا ہے۔ ''**نیور لیٹ می گو**'' کو سائنس فکشن میں ایک بڑی پیش قدمی قرار دیا گیا ہے۔ کہا جاسکتا ہے کہ انھوں نے اپنے ناولوں میں سائنس، جاسوسی اور فنٹیسی کا مرکب پیش کیا ہے۔

امن: 2017 کا امن کا نوبل پرائز ایک عالمی تنظیم ICAN یعنی International Campaign to Abolish Neauclear Weapons (ایٹمی ہتھیاروں کے خاتمے کے لیے چلائی جانے والی عالمی مہم) کو دیا گیا ہے۔ یہ عالمی تنظیم 2007 میں قائم ہوئی تھی۔ اس سے 400 غیر سرکاری تنظیمیں وابستہ ہیں۔ اس کا صدر دفتر جینوا میں ہے۔ اس تنظیم نے ایٹمی اسلحہ کے استعمال اور ایٹمی جنگ کی ہولناکیوں سے دنیا کو آگاہ کیا۔ اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا ہے کہ ایٹمی اسلحہ کا استعمال بہر حال تباہ کن ہے اور اس پر پابندی عائد ہونی چاہیے۔ اس تنظیم کا کہنا ہے کہ دنیا ایٹم بم کے استعمال کی متحمل نہیں ہوسکتی۔ اسی کی کوششوں سے جولائی میں 122 ملکوں نے اقوام متحدہ کے ایٹمی اسلحہ کے استعمال اور تیاری سے ہر حال میں گریز کرنے کے معاہدے پر دستخط کیے۔

اقتصادیات: سال 2017ء کے لیے نوبل انعام برائے معاشیات امریکی ماہر اقتصادیات رچرڈ تھائلر کو دیا گیا ہے، جو فی الحال شکاگو میں تدریسی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ نوبل کمیٹی کے اعلان کے مطابق رچرڈ تھائلر نے انسانی نفسیات کے اقتصادی فیصلوں پر پڑنے والے اثرات سے متعلق اہم تحقیق کی ہے۔ کامن سینس، سماجی ترجیحات اور ضبطِ نفس کی صفات کی عدم موجودگی کے مضمرات کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے تھائلر نے ثابت کیا کہ انسان کی ذاتی خصلتیں، فیصلوں اور ساتھ ہی ساتھ منڈی کے اتار چڑھاو پر کس طرح اثر انداز ہوتی ہیں۔ تھائلر نے ذہنی معیشت کا نظریہ پیش کیا ہے، جس میں اس بات کی وضاحت کی گئی ہے کہ لوگ اپنے ذہن میں مختلف خانے بنا کر مالیاتی فیصلہ سازی کو کس قدر آسان بنا سکتے ہیں، جس سے ہر فرد کے حساب کتاب کی نوعیت کے فیصلے کا اثر محدود ہوتا ہے جو مجموعی نتائج پر اثر انداز نہیں ہوتا۔

اقتدار اور طاقت کی ہوس جب اپنے عروج کو پہنچ جاتی ہے اور اس کا نشہ جب اپنی تمام حدوں کو سر کر لیتا ہے تو انسان کو یہ دنیا صرف بیش بہا مادی خزینوں کا ذخائر نظر آتی ہے۔ اس کے حصول میں سرگرم ہر شخص اس کو اپنا دشمن نظر آتا ہے اور جب کہ حالات ایسے ہوں کہ ہر شخص اس مشترک کوشش میں ملوث ہو تو تمام انسان ہی انسانیت کے دشمن بن جاتے ہیں۔ اسی ذہنی اور فکری تنزلی کی شکل آج ہمیں جوہری ہتھیاروں کی ذخیرہ اندوزی کی شکل میں نظر آتی ہے ہر ملک اس راہ میں ایک دوسرے سے مسابقت لے جانے میں پیش پیش ہے۔ ان جوہری ہتھیاروں کے استعمال سے پیدا ہونے والے اثرات اتنے تباہ کن ہیں کہ جس کی تاب نہ لا کر انسانیت کراہ اٹھی، ان مضر اثرات کو سماج نے بہت قریب سے دیکھا اور سمجھا ہے۔ یہ بات قابل تحسین اور لائق ستائش ہے کہ اس کے انسداد کے لئے مختلف تنظیمیں جدوجہد کر رہی ہیں جس میں بین الاقوامی تنظیم ''آئی۔کین'' (انٹرنیشنل کیمپین ٹو ابولش نیوکلیئر ویپنز) کا نام قابل ذکر ہے جس کا بنیادی مقصد ہی جوہری ہتھیاروں کے خاتمے کے لئے جدوجہد کرنا ہے۔ اس کو اسی جدوجہد کے لئے 2017 کے امن کے نوبل انعام سے نوازا گیا ہے۔

نوبل کمیٹی کی سربراہ کے بقول ''ہم اس وقت ایک ایسی دنیا میں رہ رہے ہیں جہاں ایٹمی ہتھیاروں کے استعمال کا خطرہ اس قدر زیادہ ہے جتنا ایک طویل عرصے تک نہیں تھا جس میں شمالی کوریا کی مثال ہمارے سامنے ہے، ایسے حالات میں 'آئی کین' نے جوہری ہتھیاروں کے انسداد کے لئے زبردست خدمات انجام دی ہیں''۔ گزشتہ دنوں 'آئی کین' کے دباؤ میں جوہری ہتھیاروں کو ناکارہ بنانے اور نئے جوہری ہتھیاروں پر پابندی عائد کرنے کے مقصد کے تحت ''جوہری ہتھیاروں پر پابندی'' کے اس معاہدے پر اقوام متحدہ میں 122 ممالک کی حمایت کے ساتھ 51 ممالک نے دستخط کئے جبکہ اس معاہدے کی مخالفت کرنے والوں میں جوہری ہتھیار کے مالک اور اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل کے مستقل ارکان امریکہ، برطانیہ، فرانس، روس اور چین نے متعلقہ مذاکرات اور رائے دہی کے عمل میں شرکت نہیں کی۔ آئی کین یعنی 'انٹرنیشنل کیمپین ٹو ابولش نیوکلیئر ویپنز' ایک عالمی سماجی اتحاد کی مہم ہے جو جوہری ہتھیاروں کے انسداد کے لئے سرگرم عمل ہے، اس تنظیم نے 'جوہری ہتھیاروں پر پابندی' کے معاہدے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ 1997 میں زمینی خزانوں پر پابندی عائد کرنے کے لیے عالمی سطح پر شروع کی گئی مہم سے متاثر ہو کر چند افراد نے 2007 میں آسٹریلیا کے شہر ملبورن میں اس تنظیم کی بنیاد رکھی، اس وقت 101 ممالک میں اس کی 468 معاون تنظیمیں موجود ہیں۔

اس تنظیم کا مقصد جوہری ہتھیاروں سے ہونے والی تباہ کاریوں کی جانب حکومتوں کی توجہ مبذول کرانا اور اس کے ذریعہ نئے جوہری ہتھیاروں پر پابندی عائد کرنا ہے جس کے تحت مختلف مذاکرات کا انعقاد کیا جاتا ہے اور اس کے ذریعہ ملکوں کو ان کے اس عمل کے تباہ کن اثرات کی جانب توجہ مبذول کرائی جاتی ہے ساتھ ہی حد درجہ خراب صحت اور ماحولیاتی نتائج طبی ڈھانچوں کے دن بدن کمزور ہونے اور اردگرد کے ماحول پر اس کے طویل اور دیرپا مضر اثرات کی طرف متوجہ کیا جاتا ہے۔

1945 میں جاپان کے شہر ہیروشیما اور ناگاساکی میں پیش آنے والے المیہ نے اس قسم کے جوہری اسلحوں کی تباہ کاری اور ان کے مضر اثرات کا مشاہدہ کرایا، پوری انسانی جنگی تاریخ اور اشرف المخلوقات کی خون آشامی و درندگی کے تمام تر نوشتہ جات میں جوہری اسلحہ صرف دو بار استعمال ہوا ہے، جب جنگ عظیم دوم میں امریکہ نے جاپان کے دو شہروں پر ایٹم بم گرا کر تقریباً دو لاکھ انسانی زندگیاں تلف کرنے کا ''اعزاز'' حاصل کیا تھا۔ اس سے پیدا ہونے والے اثرات کے نتیجے میں اس سے بھی زیادہ لوگ مسلسل اور متواتر مرتے چلے گئے۔

ایٹم بم کے اثرات اتنے خطرناک تھے کہ 'ایک عورت نے چند ہیا دینے والی چمک سے آنکھوں کو بچانے کے لیے اپنا ہاتھ اٹھایا تو اس کے چہرے اور ہاتھ کا گوشت لٹک کر گر گیا' ہزاروں افراد مدد کے لیے چلاتے رہے لیکن ان کو پتہ نہیں چل رہا تھا کہ ان کے ساتھ کیا ہو رہا ہے، ان کے جسم کے اعضاء جسم سے الگ کیوں ہو رہے ہیں۔ بہت سارے اور بے شمار لوگوں نے ایٹم بم کے حملے کے بعد کے اذیت ناک حالات سے گزر کر موت کی عافیت کو قبول کر لیا۔

ان حقائق کا تذکرہ 'سوزان ساؤتھ ہارڈ' نے اپنی کتاب 'ناگاساکی ایٹمی جنگ کے بعد کی زندگی' میں کیا ہے، ضرورت ہے کہ ان حقائق کو عام کیا جائے تاکہ ایٹمی اسلحوں کا ذخیرہ کرنے والوں کو 'انسانیت کا محسن' قرار دینے والوں کو اس 'ایٹمی احسان' کا محل وقوع معلوم ہو سکے۔ یہ حقیقت بھی آشکار ہو سکے کہ دنیا کی نام نہاد بڑی طاقتوں کے اسلحہ خانوں میں اتنے بڑے ایٹمی ہتھیار موجود ہیں جو شمسی کائنات میں انسانی زندگی کے ایک ہی گہوارے اس دنیا کو راکھ کا ڈھیر بنا کر کائنات میں بکھیر دینے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

محبتوں کا کارواں

محمد ارشاد ایوبی، پوسد

اسلام ایک فطری اور آفاقی دین ہے۔ قدرت کے فطری قوانین کوملحوظ رکھتے ہوئے اس کے ماننے والوں نے ہر دور میں دین کی اشاعت وسربلندی میں حصہ لیا۔ قرون اول میں اس کی کیفیت مقام کمال کو تھی اور وقت کے دھارے کے ساتھ اس کے ماننے والوں اور اس کے لئے جہد وپیہم کرنے والوں کی کیفیات میں بھی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ فطرت کا سب سے اہم عنصر جو ہر دور میں داعیان حق اور پیغمبران قوم کا وصف رہی ہے وہ ہے محبت والفت۔ اسی محبت کے ہتھیار نے ان قوموں کو آسانی سے زیر کردیا جو تلوار اور نفرت کی زبان ہی سمجھتی تھی۔ ان اقوام کو شیر وشکر کردیا جو صدیوں آپس میں دست و پا ہوتی رہی تھیں۔ محبت نے نہ صرف دلوں کو مسخر کیا بلکے سماج کے تعمیر نو کی بنیاد ہی محبت پر رکھی گئی۔ محبت کی یہ صفت نبی محمدؐ سے صحابہ میں منتقل ہوئی اور صحابہ سے بعد کے داعیان اسلام میں۔ یہ محبت ہی تھی جس نے اسلام کے سپاہیوں کو بنیان مرصوص بنادیا کہ جس سے ٹکرا کر قیصر وکسریٰ اپنی سلطنتوں سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ یہ محبت ہی تھی جس کی بنا پر معاویہؓ کو علیؓ سے اختلاف کے باوجود جب دشمن نے امداد کا پیغام بھیجا تو معاویہؓ نے یہ کہہ کر رد کردیا کہ علیؓ کی جانب کوئی آنکھ بھی اٹھاتا ہے تو ان کی جانب سے لڑنے والا پہلا سپاہی معاویہؓ ہوگا۔ آیئے دور محمدیؐ میں محبت کے اس کارواں کے چند مناظر کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ ایک مرتبہ اللہ کے نبیؐ بازار سے گزر رہے تھے۔ راستے میں ایک صحابی رسولؐ اپنی تجارت کا سامان فروخت کررہے تھے۔ یہ وہ صحابی تھے جو عرب کے ایک دیہی علاقے سے تعلق رکھتے تھے اور معاشی اعتبار سے کمزور ہونے کی بنا پر معاشرہ میں بہت زیادہ اثر والے نہ سمجھے جاتے تھے۔ محبت کے پیکر محمدؐ نے جب انھیں دیکھا تو پیچھے سے بازوؤں سے پکڑلیا اور کہنے لگے کہ اس غلام کو کون خریدے گا۔ پہلے تو وہ صحابی رسولؐ چونک گئے اور احساس ہوتے ہی کہنے لگے کہ اس غلام کو خریدنے کا کوئی فائدہ نہیں اور دیر تک اپنے جسم کو نبیؐ کے جسم سے چمٹائے رکھا۔ پیکر جمیلؐ کا معاشرہ کے کمزور طبقات کے ساتھ محبت سے لبریز ایسا والہانہ تعلق ہی تھا جس نے تحریک اسلامی کو مستحکم اور تیز گام بنایا۔ نبیؐ محترم کی اس والہانہ قلبی محبت ہی کی وجہ سے تحریک اسلامی کے ہر فرد کو یہ محسوس ہوتا کہ آپؐ مجھ سے سب سے زیادہ محبت کرتے ہیں۔

محبت، داعیان دین میں جب اپنے عروج کو پہنچتی ہے تو تاریخ کے دامن میں ایسے نقوش بھی چھوڑ جاتی ہے جو رہتی دنیا تک خادمین دین کیلئے نمونہ بن جائیں۔ ایسے ہی ایک منظر سے آپ کو ملاتا چلوں۔ حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کو دربار خلافت میں حاضری کا حکم موصول ہوتا ہے۔ پیغام ملتے ہی سعدؓ اپنی کل جمع پونجی لئے دارالخلافہ کے لئے روانہ ہوجاتے ہیں۔ دارالخلافہ میں ان کی حاضری سے قبل عمرؓ ایک دیوار کی اوٹ میں چھپ جاتے ہیں تا کہ سعدؓ کی چال ڈھال اور ساتھ موجود سامان کو دیکھ کر آپ کی کیفیت کا اندازہ کیا جائے اور آپؓ کا احتساب لیا جائے۔ سعدؓ سادہ لباس میں، وہی گھوڑا، اور وہی اندازِ بے نیازی لئے دربار خلافت میں داخل ہوتے ہیں۔ حضرت عمرؓ دیوار کی اوٹ سے نکل کر حضرت سعدؓ کو سلام کرتے ہوئے والہانہ انداز میں بغلگیر ہوتے ہیں اور آپؓ کی اس شان کو دیکھ کر بے اختیار یہ الفاظ کہتے ہیں کہ ''اے سعد تم میرے بھائی ہو''۔ رب کی رضاء کی خاطر کی جانے ولی محبت فرشتوں سے بھی اپنے حق میں دعا کرواتی ہے۔ یہ محبت جب رزم حق و باطل کے معرکہ میں ظہور پذیر ہوتی ہے تو شہداء کو مزید مراتب عطا کرتی ہے۔ ایک معرکہ کے موقع پر ایک صحابیٔ رسولؐ زخمی ہوکر گر پڑے اور ان کی صدا کو سن کر کوئی پانی لئے دوڑ اچلا آیا۔ پانی کا مشکیزہ منہ کے قریب ہی پہنچا تو قریب سے پانی مانگنے کی آواز آئی۔ ان صحابیٔ رسولؐ نے پانی کا مشکیزہ روک دیا اور اس آواز کی طرف اشارہ کرکے اپنے اس ساتھی کو پانی پلانے کے لئے کہا۔ پانی والا فرد پانی کا مشکیزہ لئے اس آواز دینے والے فرد کی جانب بڑھا تبھی اس سے قریب ایک زخمی صحابی زخموں سے کرراہتے ہوئے پانی کے لئے آواز لگانے لگے۔ دوسرے زخمی رفیق نے بھی اپنی ذات پر اپنے بھائی کو فوقیت دی۔ پانی پلانے والا فرد جب تیسرے زخمی کے پاس پہنچا تو اس کی روح مالک حقیقی سے جاملی تھی۔ پھر وہ فرد پہلے دو زخمیوں کے پاس پہنچا تو کیا دیکھتا ہے کہ ان اشخاص نے بھی جام شہادت نوش فرمالی ہے۔ محبت کی ایسی مثال شاید دنیا کبھی نہ دیکھ پائے کہ خود مرنا گوارہ کیا لیکن اپنے بھائی سے پہلے پانی پینا گوارہ نہ کیا۔ تاریخ کی کتابوں میں محبتوں کے اس کارواں نے جونقوش قائم کئے ہیں وہ اس سے پہلے دیکھنے کو نہیں ملتے۔ اللہ کے نبیؐ کے عزیز رفیق اور پہلے امیر المومنین حضرت ابوبکر صدیقؓ نے محبتوں کے کاروانِ حق کو اپنی زندگی سے مزید روشن کیا۔ آپؓ کی زندگی کا صرف ایک واقعہ آپ کو سناتا چلوں۔ ہجرت کے موقع پر جب آپؓ خاتم النبیؐ کے ساتھ غار میں تھے اس وقت اللہ کے نبیؐ کی آنکھ لگ گئی۔ آپ کا سر مبارک صدیق اکبر کے زانوں پر رکھا تھا۔ غار میں موجود سراخوں کو اپنی چادر سے بند کرنے کے باوجود ایک سراخ کھلا رہ گیا۔ آپؓ نے سوراخ پر اپنا پیر رکھ دیا تا کہ کوئی موزی جانور اللہ کے نبیؐ کو تکلیف نہ پہنچائے۔ سوئے اتفاق کہ اسی سوراخ میں موجود ایک سانپ ابوبکرؓ کو کاٹ لیتا ہے۔ اللہ کے نبیؐ کی آنکھ نہ کھلے اس غرض سے آپؓ اپنی تکلیف کو برداشت کرلیتے ہیں لیکن یہ گوارہ نہیں کرتے کے اللہ کے نبیؐ کی آنکھ بھی کھلنے پائے۔ تکلیف کی زیادتی پر آنکھوں سے آنسو نکل پڑتے ہیں جو آپؐ کے چہرہ مبارک پر پڑتے ہیں اور آپؐ آنسووں کا لمس پا کر بیدار ہوجاتے ہیں۔ تاریخ کے دامن میں ایسے بے شمار نقوش ہیں جن سے جلا پا کر محبتوں کارواں جہد وعزیمت کی بے شمار داستانیں رقم کرتا ہوا بڑھتا دیکھائی دیتا ہے۔ اپنی حیات کے ابتدائی دور سے اب تک اور آگے چل کر روز آخر تک دین کا یہ کارواں صحیح معنوں میں محبت کا کارواں بن کر ہی اپنی منزل مقصود کو پہنچے گا اور تاریخ میں مزید ایسے واقعات رقم ہوتے رہیں گے جن کی بنیاد صرف اور صرف محبت پر قائم ہوگی۔ دراصل محبت کے ان پیکروں کے مطابق ہی اللہ کے نبیؐ نے فرمایا ہے کہ اللہ تعالی فرماتا ہے ''جو میری عظمت کی خاطر آپس میں محبت کرتے ہیں ان کے لئے آخرت میں نور کے منبر ہوں گے اور انبیاء وشہداء ان پر رشک کریں گے۔'' (ترمذی:۴۳٦) اور ایسے ہی افراد کے لیے میدان حشر میں عرش الٰہی کا سایہ ہوگا کہ جن کی محبتیں صرف اللہ تعالی کے لیے تھیں۔ محبت والفت کا ظہور مختلف طریقوں سے ہوسکتا ہے۔ جیسے اپنے بھائی کی مدد کرنا، اس کی کسی غلطی پر عفو ودرگزر سے کام لینا، اس کے جان ومال کی حفاظت کرنا، اسے خود پر فوقیت دینا، اس کی ضرورتوں کو پورا کرنا، اس کی اصلاح کرنا، اور اس کے لیے دنیا کی ہر قربانی دینے کے لیے تیار رہنا وغیرہ۔ اللہ رب العزت ہمارے قلوب کو آپس میں جوڑ دے اور روز محشر ہمیں عرش کا سایہ عطا کرے۔

اکھیلا سے ہادیہ۔اور عدلیہ کی جانبداری

سید شہاب الدین، ایوت محل

کیرلا کے علاقے کوٹایم کے ایک گھر سے آنے والی آواز، میری مدد کرو، ایک بالغ اور نومسلم لڑکی، ہادیہ کی ہے۔ جو پیشہ سے ڈاکٹر ہے اور ووٹ دینے کا پورا حق رکھتی ہے۔اسی طرح وہ اپنی مرضی سے زندگی گزارنے کا،اپنی مرضی سے کھانے پینے کا اور اپنی مرضی سے تبدیلی مذہب کا بھی اختیار رکھتی ہے۔ اس آزادی کے حق کا استعمال کرتے ہوئے ہی اکھیلا اشوکن نے فیصلہ کیا تھا کہ آئندہ وہ ہادیہ رہ کر اسلام کے مطابق زندگی گزارے گی اوراس نے عملاً بھی اسلام کے مطابق عمل کیا یہاں تک کہ شادی اور مراسم عبودیت بھی اسلام کہ مطابق ہی ادا کررہی تھی۔لیکن یہ بات ہادیہ کے والد اشوکن کو ناگوار گزری انہوں نے الزام لگایا کہ ہادیہ کے ساتھ سازش ہورہی ہے وہ ناسمجھ ہے، دماغی طور پر کمزور ہے اوراسے زبردستی اسلام قبول کروایا گیا ہے تاکہ ہادیہ کو اسلامک اسٹیٹ، سیریا بھیجا جاسکے۔اسی مسئلہ کو لیکر اشوکن نے کیرلا ہائی کورٹ میں اپیل کی جس پر فیصلہ سناتے ہوئے عدالت نے کہا کہ ہادیہ نے عدالت سے پوچھے بغیر شادی کیسے کرلی۔اور ہادیہ اور شفین جہاں کا نکاح منسوخ قرار دیا۔اسی طرح ہادیہ کے قبول اسلام پر بھی سوالیہ نشان کھڑا کیا۔عدالت کے فیصلہ کے بعد ہادیہ کو اشوکن کے گھر میں قید کردیا گیا اور گھر کے سامنے پولس تعینات کردی گئی۔جبکہ شفین جہاں نے انصاف کے لیے سپریم کورٹ کا دروازہ کھٹکھٹایا ہے۔عدالت عظمہ نے بھی اس کیس میں NIA کو جانچ کے لیے کہا ہے۔

عدلیہ کی تنگ نظر : کیرلا ہائی کورٹ کے اس فیصلہ میں کوئی معقولیت نظر نہیں آتی۔کیا فرد کو اپنی زندگی اپنے مطابق گزارنے کا حق حاصل نہیں ہے۔وہ کیا کھائے، کیا پہنے ،کہاں جائے ، کیسے جائے ،عبادت کیسی کرے ، شادی کس سے کرے ایسے تمام انفرادی معاملات میں دخل اندازی کرنے کا اختیار ماں باپ، عدلیہ، مقننہ، میڈیا اور مذہبی ٹھیکیدار سمیت کسی کو نہیں دیا جاسکتا اور نہ ہی ان میں سے کسی کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ مشورہ دیں کہ آپ کو انڈا نہیں سبزی کھانی ہے، آپ شفین سے نہیں روہت سے شادی کریں۔عقل اس بات کو ہرگز قبول نہیں کرتی، نہ دستوری حق آزادی فکر وعمل اسے قبول کرتا ہے کہ ایک بالغ لڑکی جو ایک مخصوص مذہبی ذہنیت رکھتی ہے، اوراپنی ازدواجی زندگی اچھے سے بسر کررہی ہے اور خود کہہ رہی ہے کہ یہ سب وہ اپنی مرضی سے کررہی ہے تو کیا عدالت محض باپ کے شک پر ہادیہ کو یہ فیصلہ سنائے کہ جانچ ہونے تک وہ شفین جہاں کہ رشتہ زوجیت میں نہیں رہے گی ۔ جانچ ہونے تک کیا اسے قید کرلیا جائے گا۔کیا ہادیہ حکومت کی جائیداد ہے۔دنیا کی کسی عدالت کو ہرگز یہ حق حاصل نہیں ہونا چاہیے کہ وہ فرد کی انفرادی زندگی سے متعلق فیصلہ لے اگر کورٹ انفرادی زندگی میں بھی مداخلت کرنے لگے تو کوئی فرد بہتر زندگی نہیں گزار سکے گا۔ یہ بات بھی قابل غور ہے کہ اگر ہادیہ عیسائیت قبول کرلیتی، سکھ مذہب اختیار کرلیتی ، یابدھ مذہب اختیار کرلیتی تب بھی عدالت موجودہ فیصلوں پر گامزن رہتی کہ اس نے مذہب کیوں تبدیل کیا؟۔شاید نہیں، کیوں کہ عدالت پر بھی اب فرقہ پرستی اور جانبداری کے دورے پڑنے لگے ہیں۔دستور ہند اپنے ہر شہری کو دفعہ ۲۵ تا ۲۸ کے تحت اپنی مرضی کے مطابق مذہب کو اپنانے، اس پر عمل کرنے، اس مذہب کو پھیلانے ، اور مذہب کی تبدیلی کا اختیار دیتا ہے۔دستور ہند کے تخلیق کار ڈاکٹر بی آر امبیڈکر نے اسی آزادی کا استعمال کرتے ہوئے چھ لاکھ مرد وخواتین کے ساتھ ۱۴ ،اکتوبر ۱۹۵۶ کو ناگپور میں ہندو مذہب ترک کر کے بدھ مذہب قبول کیا۔جب یہ آزدی ڈاکٹر امبیڈکر کو حاصل تھی تو ڈاکٹر ہادیہ کو کیوں نہیں؟ اگر عدالتیں بھی دستور پر عمل کرنے کے مواقع نہ دیں تو کس سے امید کی جائیگی۔ ہونا تو یہ چاہیے کہ اگر عدلیہ کے ججوں کا تعلق کسی مخصوص مذہب سے ہے تو بھی فیصلہ کا جھکاؤ مخصوص مذہب کی جانب نہیں انصاف کی بنیادوں پر ہونا چاہیے۔بہتر معلوم ہوتا ہے کہ ہائی کورٹ فیصلے پر نظر ثانی کرے اور، سپریم کورٹ اس معاملے کا صحیح تصفیہ کر کے ہادیہ کو رہائی دلائے، اوراس کے انسانی حقوق بحال کرے۔ نیز عدالت مذہبی تعصب کو ختم کرنے کے لیے بھی اقدامات کرے۔

لو جہاد (Love Jihad) ایک افسانہ : لو جہاد کا مسئلہ سابقہ دہائی سے گرمایا ہوا ہے بیٹی بچاؤ بیٹی پڑھاؤ بھی اسی ذہنیت کی ایک کڑی ہے۔ ہادیہ سے متعلق بھی یہ افسانے بنائے جارہے ہیں کہ وہ لو جہاد کا شکار ہوئی ہے۔جس طرح سے عالمی میڈیا نے دہشت گردی کے نام پر اسلام اور اسکے تصور جہاد کی من چاہی تعبیریں بنا بنا کر اور فرضی دہشت گرد گروپس کے ناموں پر اسلام اور مسلمانوں کو بدنام کیا ہے۔اسی طرح سے وشوہندو پریشد نے یہ افسانہ بنایا ہے کہ مسلم لڑکے منصوبہ بندی کے ساتھ غیر مسلم لڑکیوں کو اپنے عشق میں پھانستے ہیں اور بعد ازاں ان سے شادی کرلیتے ہیں۔ پھر شادی کے بعد وہ لڑکے یا تو لڑکی کی زندگی جہنم بنا دیتے ہیں یا انہیں دہشت گردی میں لگادیتے ہیں۔اس مفروضے کا نام انھوں نے لو جہاد رکھا۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جولڑکیاں اپنے گھر، والدین، مذہب، بھائی بہن اوراپنے سماج کو چھوڑ کر جارہی ہیں کیا وہ محض عشق کا چکر ہے یا تلاش ہے ایک ایسے کلچر کی جو فطرت کی پکار ہو، ایسے مذہب کی جہاں حقیقی آزادی اور عزت ملے۔دوسرا سوال لو جہاد کے افسانہ کو دیکھتے ہوئے یہ بھی اٹھنا چاہیے کہ کچھ ایسی بھی مسلم لڑکیاں ہیں جو ہندو لڑکوں سے شادی کرچکی ہیں۔سوہا علی خان سے کسی نے نہیں پوچھا کہ آپ نے کنال کھیمو سے کیوں شادی کی ہے۔مسلمانوں کے کسی ادارے نے اس پر کوئی سوال نہیں اٹھایا اور یہ سمجھا کہ وہ فرد کی اپنی آزادی ہے۔کیوں کہ اسلام نے یہ تعلیم واضح کردی ہے کہ "مشرک مرد یا مشرک عورت سے نکاح نہ کرو جب تک وہ ایمان نہ لائیں۔ "اسلام میں کوئی زور زبردستی نہیں ہے بلکہ فکر وعمل کی پوری پوری آزادی ہے۔

اگر غیر جانبدادری سے جائزہ لیا جائے تو قبول اسلام اوراس سے متصل نکاح میں تین قسم کے حالات عموماً پیش آتے ہیں۔(۱) مسلم لڑکا یا لڑکی کسی غیر مسلم سے محبت کرتے ہیں اور ایک دوسرے سے شادی کرنے کی غرض سے اسلام قبول کرلیتے ہیں اس معاملے میں مقصد شادی کرنا ہوتا ہے۔(۲) چونکہ ہندو میرج ایکٹ کے مطابق مرد دوسری شادی نہیں کرسکتا اس لیے قانون سے بچنے اور شادی کرنے کے لیے مرد وعورت اسلام قبول کرتے ہیں۔ جیسے دھرمیندر ہیما مالینی اور ہریانہ کے فضا محمد و چاند محمد۔(۳) تیسری قسم کا معاملہ وہ ہوتا ہے جس میں کوئی غیر مسلم اسلام کے اصولوں سے،عقائد سے،طریقہ عبادت وغیرہ سے متاثر ہوکر اوردل کی آمادگی کے ساتھ اسلام قبول کرتا یا کرتی ہے۔اور پھر اسلامی معاشرہ اس کا نکاح کسی مسلم فرد سے کروادیتا ہے۔اور اگر بات لو جہاد کی کریں تو یہ صرف ایک فرضی افسانہ ہے۔ بہن ڈاکٹر ہادیہ نے بہت سوچ سمجھ کر اسلام کو قبول کیا۔اسلام کی تربیت لی اور پھر رشتے کی تلاش کرنے کے بعد شفین جہاں سے نکاح کیا۔ یہ نہ کوئی لو جہاد کا معاملہ ہے نہ ہی کوئی عشق ومحبت کی داستان بلکہ ایک ایمان افروز قبول اسلام کی داستان ہے۔ اسلیے مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ ہادیہ کے ساتھ کھڑے ہوں تاکہ یہ Message جائے کہ ہم اپنے ہر نومسلم بھائی اور بہن کے ساتھ ہمیشہ کھڑے رہتے ہیں۔

اس کالم کے تحت قارئین کے سوالات کے جوابات دینے کی کوشش کی جائے گی۔اپنے سوالات بذریعہ ای میل یا واٹس ایپ (9673022736) پر بھیج سکتے ہیں۔

سوال : ایس آئی او کی پالیسی میں سوشل سائنس کو بہت زیادہ اہمیت دی گئی ہے۔کیا یہ مناسب ہے؟ مجھے سوشل سائنس میں بالکل دلچسپی نہیں ہے،لیکن بارہویں جماعت میں نشانات کم ہونے کی وجہ سے اکثر لوگ مجھے سوشل سائنس میں داخلہ لینے کا مشورہ دیتے ہیں۔کیا میرے لئے بی ایس سی جیسے کورسیس کرنا مناسب نہیں ہے؟ (ندیم احمد، بیدر)

جواب : آپ کے سوال کے دو حصے ہیں اور ان کو مختلف طریقہ سے جواب دینا ہوگا۔پہلی بات یہ کہ ایس آئی او کی پالیسی میں سوشل سائنس کو اہمیت ایک مخصوص سماجی مزاج کے تناظر میں دی گئی ہے۔اگر یہ سماجی تناظر باقی نہ رہے تو اس پالیسی کی بھی کوئی اہمیت نہیں رہے گی۔وہ سماجی تناظر یہ ہے کہ ہندوستان میں سماجی تبدیلی کے لئے جن سماجی، سیاسی، فلسفیانہ اور معاشی محاذوں پر کام کرنے کی ضرورت ہے، ان میں دیندار اور ذہین مسلم حضرات کی زبردست قلت ہے۔یہ قلّت تحریک اسلامی کی ایک بڑی کمزوری ہے۔اسی وجہ سے ہم ابھی تک تبدیلی کا کوئی واضح لائحہ عمل تلاش نہیں کر پائے ہیں۔اسی کے ساتھ متبادل نظام جو کہ قرآن وسنت سے آہنگ رکھے اس کی صورت گری کرنے سے اب تک قاصر ہیں۔مثلاً ہم نے اب تک اسلامی حکومت کا وہ نقشہ پیش نہیں کیا جو کہ قرآنی اصول مشاورت کے مطابق ہو ساتھ ہی وہ قائد کو جمہور کا غلام بنانے والا نہ ہو۔ان تمام اصولوں کی فروغ کو تیار کرنا اور منطقی نقشہ بنانا ایک بہت ہی اہم ذمہ داری ہے جسے امت مسلمہ کو مجموعی حیثیت میں ادا کرنا چاہئے۔لیکن امت مسلمہ کا ذہین طبقہ صرف پروفیشنل کورسیس اور ایسے کورسیس جن کے ذریعے پیسہ کمانا جلد از جلد ممکن ہو ایسے ہی کورسیس میں پیش رفت کر رہا ہے۔اس لئے امت کی توجہ کو اس ضرورت کی طرف مبذول کرنے اور ذہین طلبہ کو دین کی خدمت کا ایک اہم محاذ دینے کی غرض سے گذشتہ کچھ میقاتوں سے یہ پالیسی اپنائی گئی ہے۔البتہ یہ تناظر تبدیل ہو جائے تو ایس آئی او کی یہ پالیسی کے باقی رہنے کی کوئی وجہ نہیں رہ جائے گی۔

دوسری بات یہ کہ کیا آپ کو سماجی علوم میں ڈگری حاصل کرنا چاہئے یا نہیں اس کا فیصلہ ایس آئی او کی پالیسی اور مقامی ذمہ داران کی خواہش کی بنیاد پر کرنا مناسب نہیں ہے۔اس کا فیصلہ اس بنیاد پر ہونا چاہئے کہ کیا آپ کسی بھی مخصوص کورس میں 'حقیقی' دلچسپی اور 'قابل قدر' صلاحیت رکھتے ہیں یا نہیں (اس میں وسائل کا بھی کردار ہے،لیکن چونکہ آپ نے وسائل کا حوالہ نہیں دیا ہے اس لئے جواب میں بھی اسے شامل نہیں کیا گیا)۔اگر آپ کسی سماجی علوم کے مضمون میں بی اے کی ڈگری وغیرہ میں داخلہ لے لیں گے مگر آپ کی دلچسپی پھولوں پودوں پر غور وفکر کرنے میں ہے، تو آپ تاریخ کی کلاس میں کھڑکی سے باہر کے درختوں پر زیادہ توجہ رکھیں گے۔اس میں آپ کا ادارہ، آپ کی تنظیم، آپ کے والدین اور سب سے اہم آپ کو خود بہت بڑے نقصانات ہیں۔یہ جبر آپ کی فہم وتدبر کی قوت کو کمزور کردے گا۔اور آپ دونوں میں سے کسی ایک بھی مضمون میں مہارت حاصل کرنے سے محروم رہ جائیں گے۔

ہم اصولی طور پر تو اس بات کے قائل ہیں کہ تعلیم روزگار کے لئے حاصل کرنا مناسب نہیں ہے۔لیکن فی زمانہ یہ ایک المیہ ہم دیکھتے ہیں کہ روزگار اور تعلیم لازم وملزوم کی حیثیت اختیار کر چکے ہیں۔اس اعتبار سے قابل قدر روزگار کا حصول بھی ہمارے پیش نظر ہونا ضروری ہے۔وہ کورسیس جن میں با آسانی مستحکم روزگار کا حصول ممکن ہے ان میں داخلہ لینا کوئی بری بات نہیں ہے۔سوشل سائنسیس میں بالعموم ان لوگوں کو روزگار میسر آتا ہے جن کا اکیڈمک رکارڈ بہت اعلیٰ ہو۔جن کا اکیڈمک ریکارڈ بہترین نہ ہو ان کے لئے فی الحال روزگار کے بالکل مواقع میسر نہیں ہیں۔اس لئے اگر بہترین انداز میں سماجی علوم کو حاصل کرنے کا داعیہ اور صلاحیت موجود ہو، تب ہی ان کورسیس میں داخلہ لینا مناسب ہے۔

سوال : آج کل پرنٹ میڈیا کا زمانہ ختم ہو رہا ہے۔ہم کئی بڑے رسالوں اور اخبارات کو اپنے پرنٹ ورژن بند کرکے صرف ای ورژن پر توجہ دیتے ہوئے دیکھتے ہیں۔کیا رفیق منزل کے لئے بھی اس تجربہ کا کرنا فائدہ مند نہیں ہوگا؟ (جہاں زیب عالم، بنگلور)

جواب : اس سوال کے لئے آپ کا بہت شکریہ! رفیق منزل اردو بولنے والے طلباء ونوجوانوں کو مخاطب کرنے والا رسالہ ہے۔یہ نوجوان جن ذرائع سے تعلق رکھتے ہیں اُنہیں ذرائع کا استعمال کرتے ہوئے ہمیں ان کو مخاطب کرنا ہوگا۔ہمارے تجربہ کے مطابق رفیق منزل کے قارئین پورے ہندوستان میں پھیلے ہوئے ہیں۔ایسے مقامات جہاں طلباء ونوجوان انٹرنیٹ کے استعمال سے بہت زیادہ واقف نہیں ہیں اور ان کے یہاں اسمارٹ فون کی سہولیات میسر نہیں ہیں وہاں بھی رفیق منزل پڑھا جاتا ہے۔اس اعتبار سے پرنٹ ورژن کی معنویت فی الحال رفیق منزل کے لئے بہت زیادہ ہے۔

ہم البتہ ایلکٹرانک (برقی) میڈیا میں بھی ہماری موجودگی کو محسوس کروانا چاہتے ہیں۔اس ضمن میں اکثر وبیشتر یہ بات کہی اور سنی جاتی ہے کہ یہ بہت سستا اور آسان ذریعہ ہے۔لیکن ادارہ رفیق منزل اس بات سے بہ خوبی واقف ہے کہ یہ ایک مغالطہ ہے۔برقی میڈیا میں اپنی موجودگی منوانے کے لئے تزئین وآرائش اور متحرک نظام کی ضرورت ہے۔اسی کے ساتھ مضامین کو چوری ہونے سے بچانا اور کریڈٹس کا اعتراف کروانا ایک مشکل اور مہنگا عمل ہے۔ان تمام مشکلات کے علی الرغم دو محاذوں پر ہماری کوشش جاری ہے۔پہلی، رفیق منزل کا ایک خوبصورت، مزئین، حرکی اور استعمال میں آسان ویب سائٹ کی تیاری؛ دوسرے محاذ پر ایک نیا موبائل ایپلکیشن جو قارئین رفیق کے مابین اور مضمون نگاران کے درمیان تبادلہ خیال کا موقع فراہم کرے گا۔ان دونوں ذرائع کے تحت ہم پرنٹ ورژن سے زیادہ مواد قارئین کو فراہم کریں گے۔

ظاہر ہے یہ کام ہمارے محدود وسائل کے ساتھ کرنا ایک مشکل امر ہے۔لیکن اللہ رب العزت نے رفیق منزل کو ایسے رفقاء سے نوازا ہے جو بے لوث اور دیوانہ وار اس کی ترقی کے لئے کوشاں رہتے ہیں۔ایسے ہی رفقاء کی مرضی اور خواہش کے مطابق یہ کام ہوتا آیا ہے۔آپ کے اس سوال کے جواب کے ذریعے میں دیگر رفقاء تنظیم ورفقاء رفیق سے گذارش کرتا ہوں کہ اس کام کو انجام تک پہنچانے میں دامے درمے سخنے مدد کریں۔انشاء اللہ بہت جلد ہم آپ کے سامنے پرنٹ ورژن کے ساتھ ایک برقی رفیق منزل کو بھی پیش کریں گے۔

عبدالحفیظ، تلنگانہ

جہاز کا سفر بڑی اچھی چیز ہے۔ ہر شخص کو زندگی میں کم از کم ایک بار ضرور کرنا چاہئے۔ اگر میرا بس چلے تو ملک کے ہر شہری کے لئے لازمی قرار دے دوں۔ ٹکٹ کاؤنٹر سے اڑنے اور لینڈنگ تک، ہر لمحہ آدمی سیکھتا ہی رہتا ہے۔ عبداللہ بھی لائن میں لگا تلاشی کے عمل سے گذر رہا تھا۔ دھات کی ہر چیز باہر رکھنی پڑ رہی تھی۔ وہ سوچنے لگا کہ شاید جنت میں بھی کوئی میٹل ڈیٹکٹر قسم کا گیٹ ہو۔ اگر آپ کے دل میں حسد، کینہ، ظلم، بغض وغیرہ ہو تو وہ ٹوں ٹوں کرتا رہے اور جب تک جہنم کی آگ ان تمام ملاوٹوں کو پگھلا کر راکھ نہ کردے، آپ کو آگے جانے کی اجازت نہ ملے۔

مگر خیر یہ تو دنیا ہے۔ جلد ہی تلاشی سے جان چھوٹی۔ آگے بورڈنگ کاؤنٹر تھا۔ ہر شخص ہاتھ میں اپنا بورڈنگ پاس پکڑے جلدی میں تھا، سامان کاؤنٹر پر چھوڑ کر آگے بڑھتا جارہا تھا۔ اصل زندگی میں بھی ایسا ہی ہوتا ہے۔ ہر شخص اپنی واپسی کا بورڈنگ کارڈ لے کر ہی دنیا میں آتا ہے اور یہ بھول جاتا ہے کہ سامان تو کاؤنٹر پر جمع کرانا ہوتا ہے اور وہ بھی ایسا جو منزل پر کام آئے۔ مگر وہ زندگی بھر اپنی ہی جھولی بھرتا رہتا ہے۔

ڈیپارچر لاؤنج سے آگے بس میں بیٹھے اور جہاز کی طرف چلے، آسمانوں میں اڑنے والے جہاز تو چھوٹے چھوٹے دکھتے تھے مگر یہاں تو ایک بہت بڑا جہاز تھا۔ جیسے جیسے بس قریب ہوتی گئی، جہاز بڑا ہوتا چلا گیا۔ عبداللہ کا قد، جہاز کے پہیے کے نچلے حصے تک بھی نہیں پہنچ رہا تھا۔ عبداللہ سوچنے لگا کہ بندے اور اللہ کی رحمت میں تعلق بھی کچھ ایسا ہی ہے بندہ رب سے جتنا قریب ہوتا ہے، اس کی رحمت اتنی ہی بڑی نظر آتی ہے۔

کچھ دیر میں جہاز نے اُڑان بھری، عبداللہ کھڑکی سے نیچے جھانکنے لگا۔ لوگ چھوٹے ہوتے چلے گئے۔ پھر گاڑیاں، عمارتیں، سب بونی ہوگئیں۔ پھر بادل اور پھر کھلا آسمان۔ عبداللہ سوچنے لگا کہ اللہ جو سب سے بڑا ہے، جو ساری کائنات سے بھی اوپر ہے، اسے کیسا لگتا ہوگا جب کوئی چھوٹا سا آدمی، کسی چھوٹے سے ملک کے چھوٹے سے شہر میں، اس چھوٹی سی دنیا میں رہتے ہوئے خدا کو چیلنج کرتا ہوگا یا سمجھتا ہوگا کہ دنیا اس کے دم سے ہے۔ غرور کے ماروں کو سزا کے طور پر ٹیک آف اور لینڈنگ دکھانی چاہئے۔ اب وہ جہاز جو کسی بڑی وہیل سے بھی بڑا تھا بالکل چھوٹا لگ رہا تھا۔ اور کمزور اتنا کہ ایک پرندہ ٹکرا جائے تو بھک سے غبارے کی طرح پھٹ جائے۔

ہمارے اندر پلتا ہوا فوعونیت اور انا کا جن بھی صرف مخصوص لوگوں، حالات و معاشرے میں ہی چڑھ دوڑتا ہے۔ ذہن کا کینوس وسیع ہو تو انا و غرور کے بت خود بخود ڈھ جاتے ہیں۔

تھوڑی دیر میں کھانا سَرو کردیا گیا۔ کھانے میں مچھلی تھی۔ عبداللہ پھر سوچ میں پڑ گیا کہ اس غریب مچھلی کے وہم و گمان میں بھی نہ ہوگا کہ میں جو سمندر کی تہہ میں رہتی ہوں۔ مجھے آسمانوں میں بادلوں سے اوپر کھایا جائے گا۔ وہ اللہ جو سمندر کی تہہ سے رزق نکال کر آسمانوں پر کھلانے پر قادر ہے کیا وہ زمین کا رزق زمین پر رہتے ہوئے نہیں پہنچا سکتا؟

جہاز سکون سے لگے بندھے راستے پر اڑا چلا جارہا تھا۔ کاک پٹ میں لگا کمپاس اس کی ہدایت کے لئے کافی تھا جو اسے بھٹکنے نہیں دیتا تھا ہماری زندگیوں کا بھی کمپاس شریعت کے طور پر آیا ہے مگر ہم اسے دیکھتے ہی نہیں اور بھٹکتے چلے جاتے ہیں۔ مشرکوں کی دعاؤں کی طرح جس سے مانگیں اسے بھی نہیں پتا کہ اس سے مانگا جارہا ہے۔

مسلمانوں کی دعائیں تو نہیں بھٹکتیں۔ اللہ پاک سب سنتا ہے سب جانتا ہے۔ جہاز نے اچانک ایک جھٹکا کھایا۔ شاید کسی طوفان سے گذر رہا تھا۔ لوگوں نے پرواہ نہ کی۔ پھر ایک اور جھٹکا۔ پھر کوئی خاص توجہ نہ دی گئی۔ اب لگاتار جھٹکے اور زور زور سے۔ اب لوگ سیدھے ہو کر بیٹھ گئے۔ سیٹ بیلٹس باندھ لیں اور دعائیں مانگنے لگ گئے۔ پھر کچھ ہی دیر میں اڑان ہموار ہوگئی۔ ہم اپنی زندگی میں بھی یونہی کرتے ہیں۔ سپردگی نہیں کرتے۔ ایک کے بعد ایک چیلنج لینے کو تیار رہتے ہیں۔ آخر پہلے جھٹکے میں ہی اللہ سے رجوع کرلیں تو کیا ہی اچھی بات ہوتی۔ اللہ کے سامنے بہادری تو کوئی کافر ہی دکھا سکتا ہے۔

جہاز نے لینڈنگ شروع کی۔ عمارتیں، گاڑیاں اور لوگ بڑے ہوتے چلے گئے۔ یہ دنیا ہے ایسی، جتنا اس کے پاس جاؤ یہ اتنی ہی بڑی لگتی ہے۔ اور پھر لوگ بڑھ چڑھ کر سامان حاصل کررہے تھے۔ سب کو جلدی تھی اور ایسی جلدی میں سب بھول گئے کہ جہاز کسی اور کا ہے۔ پائلٹ کوئی اور ہے۔ حکم کسی اور کا چلتا ہے۔ ہم تو بس مسافر ہیں۔

سخن

حق بات جب سے سب کو سنانے میں لگ گیا
سارا جہان مجھ کو مٹانے میں لگ گیا

گر میں نہ ڈھونڈ پایا کسی مسئلے کا حل
تو بھی تو بس بہانے بنانے میں لگ گیا

تقدیر جب سے ہوگئی ہے مجھ پہ مہرباں
ہر کوئی مجھ کو اپنا بنانے میں لگ گیا

جھگڑوں سے مسلکوں کے الگ رہ کے دوستو
باطل کے نقش میں بھی مٹانے میں لگ گیا

جانا نہیں ہے چھوڑ کے میدان اس لئے
ساحل پہ کشتیاں میں جلانے میں لگ گیا

چاہا تھا میں نے گھر میں کروں روشنی مگر
طوفان مرا چراغ بجھانے میں لگ گیا

کہتے ہیں جس کو میڈیا، سب کام چھوڑ کر
دہشت پسند ہم کو بتانے میں لگ گیا

اجداد سے الگ ترا کردار ہے بہت
رہبرؔ یہ تجھ کو یاد دلانے میں لگ گیا

توصیف رہبر، تلنگانہ

شخصیت خاص
ٹام آلٹر

(1950 - 2017)

ایک ایسے خطے میں جہاں برطانوی راج تقریباً ایک صدی حکومت کر کے چلا گیا مگر پیچھے جس متاثرہ افسر شاہی کو چھوڑ گیا وہ انگریزی بولنے اور سمجھنے کو ہی ترقی کی معراج سمجھتی ہے اور قومی وعلاقائی بولی بولنے والوں کو کمتر جانتی ہے، ان لوگوں کے لیے امریکی پادری کے بیٹے ٹام آلٹر ایک زبردست مثال تھے، انڈین فلموں اور اسٹیج پر اداکاری کے جوہر دکھانے والے ٹام آلٹر کو شستہ اردو بولتے جس نے بھی دیکھا اور سنا وہ اس کا گرویدہ ہوگیا۔

اردو زبان کے شیدائی اور اردو تھیٹر میں اہم مقام رکھنے والے مشہور اداکار ٹام الٹر ایک امریکی نژاد ہندوستانی تھے۔ ان کی پیدائش 22 جون 1950 کو مسوری اتراکھنڈ میں ہوئی۔ ٹام آلٹر نے ابتدائی تعلیم Wood Stock School مسوری میں حاصل کی۔ اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے امریکہ گئے لیکن جلد ہی واپس لوٹ آئے۔ انہوں نے پونا کے "فلم اینڈ ٹی وی انسٹی ٹیوٹ" میں بھی تعلیم حاصل کی۔

راجیش کھنہ کی فلم "ارادھنا" دیکھنے کے بعد ٹام نے فلموں میں آنے کا فیصلہ کرلیا۔ 1976 میں دھرمیندر کی فلم "چرس" سے اپنے فلمی کیریئر کا آغاز کیا۔ اور 300 فلموں میں اداکاری کی۔ ٹام نے ہندی، اردو فلموں کے علاوہ تیلگو، تامل، آسامی اور بنگالی فلموں میں بھی کام کیا۔ علاوہ ازیں جن غیر ملکی فلموں میں ٹام نے اداکاری کی ان میں رچرڈ ایٹن بروو کی "گاندھی" اور "ون نائٹ ودا کنگ" بہت مشہور ہیں۔ ٹام الٹر کی آخری فلم "سرگوشیاں" رواں برس ریلیز ہوئی۔ اس کے علاوہ ٹام نے تھیٹر اور ٹیلی ویژن شو بھی کیے۔ ان کے مشہور تھیٹر ڈراموں میں لال قلعہ کا آخری مشاعرہ کافی مشہور ڈرامہ ہے جس میں انہوں نے بہادر شاہ ظفر کا رول ادا کیا ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد پر بنایا گیا ان کا ڈرامہ "آزاد کا خواب" بھی کافی پسند کیا گیا۔ صحیح بات یہ ہے کی انہوں نے اپنے ڈراموں میں خصوصاً مولانا ابوالکلام آزاد اور بہادر شاہ ظفر کا زبردست کردار ادا کیا ہے۔

ٹام اردو زبان کے مداح تھے۔ اور اسے اپنی مادری زبان کہتے تھے۔ انہیں اردو ادب وشاعری سے کافی دلچسپی تھی۔ امریکی النسل ہونے کے باوجود ان کا اردو تلفظ کمال کا تھا۔ ٹام نے چند برس صحافت میں بھی طبع آزمائی کی۔ تین کتابیں بھی لکھیں۔ فلم انڈسٹری میں ان کی اعلیٰ خدمات کے اعتراف میں حکومت ہند نے 2008 میں ان کو پدم شری ایوارڈ سے نوازا۔ آخری ایام میں وہ کینسر کے مریض ہوگئے تھے اور بالآخر 30 ستمبر 2017 کو 67 سال کی عمر میں انتقال کرگئے۔

شیخ انس

خاص کتاب

The Art of Thinking Clearly

کیا انسان صد فی صد غیر جانبدار ہو سکتا ہے؟ بالکل صحیح خیال ہے آپ کا۔ جی نہیں۔ انسان کی قوت فیصلہ بے شمار تعصّبات Biases سے متاثر ہوتی رہتی ہے۔ اور یہ اثرات اکثر و بیشتر انسان کے فیصلے کو کمزور کرتے ہیں۔ یہ فیصلے نہ صرف بڑے معاشی وسماجی معاملات سے، بلکہ روزمرّہ کی زندگی میں ہماری چھوٹی موٹی خریداریوں سے متعلق بھی ہو سکتے ہیں۔ ان تعصّبات کا محرک کبھی ہمارا اندرون ہوتا ہے تو کبھی خارجی محرکات جیسے تشہیر وغیرہ بھی ہو سکتے ہیں۔ انھی تعصّبات کا احاطہ کرتی ہوئی یہ کتاب سوئیٹزرلینڈ کے مشہور رائٹر "رالف ڈوبیلی" کے ننانوے مختصر مضامین کا مجموعہ ہے، جو پہلے کئی سوئیس اخبارات میں شائع ہوئے، بعد میں کتابی شکل میں دیگر بہت سی زبانوں میں منظر عام پر آئے۔ ہر مضمون انسانی سوچ کے کسی تعصب Bias پر مبنی ہے، اور اس تعصب سے خود کو دور کیسے رکھا جائے اس پر بھی گفتگو کرتا ہے تا کہ قاری اپنی قوت فیصلہ کو مضبوط کر سکے۔ جگہ جگہ دلچسپ مثالوں سے مصنف نے بات کو بخوبی واضح کیا ہے۔ کچھ جگہوں پر مصنف کا سخت گیر ملحدانہ فکر بھی چھلکتا ہے۔ مجموعی طور پر ایک نہ صرف دلچسپ بلکہ قوت فیصلہ سازی کی نمو کے لئے بہترین کتاب ہے۔
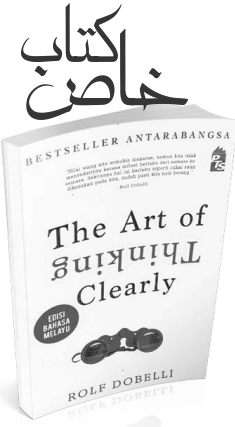
"جب انسان کا ایمان اللہ کی ذات پر کمزور ہوتا ہے اور اس میں توکل نہیں ہوتا تو پھر اس کا اعتقاد دنیاوی چیزوں میں بڑھ جاتا ہے، روپے میں، مال و زر میں، بچتوں اور جمع پونجیوں میں۔۔۔ وہ اللہ کی ذات کو باہر رکھ کر بیٹھ جاتا ہے اپنا مستقبل پلان کرنے۔۔۔ اتنا پیسہ جوڑوں گا تو اس سال یہ لوں گا۔۔۔ کسی رشتہ دار یا ضرورت مند کی مدد کردوں گا پھر قرض واپس نہ ملنے پر اتنا پیسہ ڈوب جائے گا۔۔۔ کون سے سال کونسی گاڑی ہونی چاہئے، بچوں کو پڑھانے کے لیے بھی پائی پائی جوڑنی ہوگی، بیٹیوں کی شادی کی لیے بھی پیسہ ہاتھ میں ہونا چاہئیے، بیماری کا علاج بھی پیسے سے ہوتا ہے، ان ساری چیزوں کے بارے میں سوچتے سوچتے انسان کو پتا ہی نہیں چلتا وہ کب اللہ کی ذات کو پیچھے کرتے روپے کو آگے لے آتا ہے، روپے سے ایسا رشتہ جوڑ بیٹھتا ہے کہ اس سے علیحدگی کا تصور بھی نہیں کر پاتا۔۔ اس کی افزائش اور بڑھوتری پر خوشی سے پاگل ہوا جاتا ہے۔ اس سے اثاثے بنا لینے پر اپنی اور اپنے بچوں کی زندگی اور مستقبل کو محفوظ سمجھتا ہے۔۔۔ یہ اس پیسے کی حرص کا شیطانی کا اثر ہے جس سے انسان کو لگتا ہے دنیا کا سسٹم چلتا ہے۔۔۔ حالانکہ دنیا کا نظام تو اللہ چلاتا ہے۔ وہ لمحہ بھر میں سالوں کی جمع پونجیاں خاک کردے۔۔۔ اللہ کو نظر انداز کر کے حرام کے ذریعے بنائے جانے والے اثاثوں کو انہیں کے ہاتھوں تباہ و برباد کردے۔۔۔ پھر انسان کیا کریگا۔۔۔؟؟"

حمیرہ احمد (ماخوذ)

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ

زکریا

امام ابوحنیفہ کا اصل نام نعمان بن ثابت تھا۔ ابوحنیفہؒ آپ کی کنیت تھی۔ آپ تابعین میں سے تھے اور نسلاً فارسی تھے۔ آپ کی پیدائش عراق کے مشہور شہر کوفہ میں ۸۰ ہجری میں ہوئی اور وفات ۱۵۰ ہجری میں ہوئی۔ شہر کوفہ، بصرہ، مکہ اور مدینہ سمیت اُن چار بڑے شہروں میں سے ایک تھا جو اپنے وقت میں علم کی دنیا تصور کئے جاتے تھے۔ آپ نہایت ذہین اور بااخلاق تھے۔ آپ کا تعلق ایک تاجر خاندان سے تھا جو ''خزباقی'' نامی ایک خاص کپڑے کی تجارت کیا کرتا تھا۔ عام طور پر بڑی بڑی شخصیات کے بچپن اور نوجوانی کے بارے میں ہم مطالعہ کریں تو اس میں ایک انفرادیت نظر آتی ہے جو اس فرد کے روشن مستقبل کی نشاندہی کرتی ہے۔ لیکن امام ابوحنیفہؒ کے یہاں ہمیں یہ چیز نہیں ملتی۔ آپ نے ایک تاجر کی حیثیت سے نشونما پائی اور غالباً عمر کے بیسویں سال تک کسی بھی عالم کی درسگاہ میں شمولیت اختیار نہیں کی، اس کی کئی وجوہات تھیں۔ ایک تو یہ کہ اِس وقت کے ریاستی گورنر اکثر جابر و ظالم تھے اور ہر طرف ان کی بے اعتدالیوں کے اثرات تھے اور اُس زمانے میں حصولِ علم کا وہ عوامی رجحان نہ تھا جو بعد کے اَدوار میں پایا جاتا ہے۔ دوسری بڑی اور اصل وجہ یہ تھی کہ امام کا تعلق ایک تاجر خاندان سے تھا اور وہاں انھیں ایسے محرکات میسر نہ تھے جو حصولِ علم کی طرف رغبت دلاتے۔ اس کے باوجود ایسا بالکل نہ تھا کہ امام حصولِ علم سے بالکل بے نیاز تھے بلکہ وہ اپنے اندر اس کی شدید خواہش پاتے اور اندر ہی اندر اس بات پر نادم ہوا کرتے کہ وہ علم سے دوٗر ہیں۔ اِسی اثناء میں ایک واقعہ پیش آگیا جو امام کے نزدیک حصولِ علم کا اصل محرک تھا۔

کوفہ میں اس وقت بڑے بڑے محدثین، فقیہ اور مفسرین پائے جاتے تھے جن میں ایک بڑا نام امام شعبیؒ کا تھا۔ ایک دِن امام بازار جا رہے تھے۔ امام شعبی کا مکان راہ میں تھا۔ سامنے سے نکلے تو انھوں نے یہ سمجھ کر کہ کوئی نوجوان طالب علم ہے، پاس بلایا اور پوچھا کہ کہاں جا رہے ہو؟ انھوں نے ایک سوداگر کا نام لیا۔ امام شعبی نے کہا میرا مطلب یہ نہ تھا۔ تم پڑھتے کس سے ہو؟ اُنھوں نے افسوس کے ساتھ جواب دیا کہ ''کسی سے بھی نہیں''، شعبی نے کہا کہ ''مجھ کو تم میں قابلیت کے جوہر نظر آتے ہیں، تم علماء کی صحبت میں بیٹھا کرو۔'' اِس نصیحت نے ان کے دِل میں گھر کر لیا اور نہایت اہتمام سے تحصیلِ علم پر متوجہ ہوئے۔ کوفہ کے ایک محدث حماد بڑے مشہور تھے اور انھیں کا حلقہ درس کوفہ میں سب سے وسیع تھا۔ ابتدائً امام نے انھی کے حلقۂ درس میں شمولیت اختیار کی۔ امام کی تربیت میں امام شعبی کا بھی بڑا کردار رہا اور تقریباً کوفہ میں کوئی عالم دین ایسا باقی نہ تھا جس سے امام ابوحنیفہؒ نے زانوائے شاگردی تہ نہ کیا ہو۔ کوفہ کی طرح بصرہ بھی اِس زمانے میں علوم و فنون کا مرکز تصور کیا جاتا تھا۔ حسن بصریؒ، قتادہؒ اور امام شعبہؒ جیسے لوگ وہاں پر تعلیم و تبلیغ کے خدمات انجام دیا کرتے تھے۔ کوفہ کے بعد امام نے بصرہ کا رُخ کیا۔ حسن بصریؒ کے درس سے امام ابوحنیفہؒ کو مستفید ہونے کا موقع نہیں ملا البتہ قتادہؒ اور شعبہؒ جیسے بزرگوں سے امام نے بہت کچھ حاصل کیا۔ شعبہ بہت بڑے رتبہ کے محدث تھے۔ امام شافعیؒ ان کے بارے میں فرمایا کرتے کہ اگر شعبہ نہ ہوتے تو عراق میں فن حدیث کا رواج نہ ہوتا۔ شعبہؒ کو امام ابوحنیفہؒ سے ایک خاص رغبت تھی۔ غیب میں اکثر ان کی ذہانت اور خوبیٔ فہم کی تعریف کرتے۔ ایک بار ان کا ذکر آیا تو کہا کہ ''جس طرح میں جانتا ہوں کہ آفتاب روشن ہے اسی یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ علم اور ابوحنیفہؒ ہم نشین ہیں۔'' (جاری)

کوئی تو بتائے۔۔

یہ رستے، یہ گلیاں، یہ سنسان راہیں
یہ سب کا کنارہ کہیں پر تو ہوگا
کہاں سے شروع اور کہاں پر ختم ہے
یہ سب کا پتہ تم کسی کو تو ہوگا
یہ بنتے ہیں کیسے کوئی تو بتائے

میری آنکھ میں جو یہ پانی کے قطرے
بنا بادلوں کے یہ آتے ہیں کیسے
کیا بجلی کھڑکنے کی آواز آئی
یہ شبنم کی بوندوں کا میلہ لگا ہے
یہ آتے ہیں کیسے کوئی تو بتائے

یہ کونپل جو مٹی سے یوں جھانکتی ہے
کہ جیسے یہ دنیا اسی کے لئے ہے
یہ کونپل سے بنتا ہے چھوٹا سا پودا
اور پودے سے ایک پیڑ بنتا ہے کیسے
یہ بڑھتا ہے کیسے کوئی تو بتائے

کھلے آسمانوں میں اڑتے پرندے
تعین یہ سمتوں کا کرتے ہیں کیسے
ہر ایک شام گھر پر یہ واپس ہیں آتے
پتہ اپنے گھر کا یہ رکھتے ہیں کیسے
یہ کرتے ہیں کیسے کوئی تو بتائے

عدنان شبیبی

مسکرائیے

استاد بچوں سے: اچھا گرامر کے لحاظ سے بتاؤ کہ یہ کونسا زمانہ ہے ''بچے نقل کر رہے ہیں''
ننھا بچہ: جناب یہ امتحان کا زمانہ ہے۔

ایک بچہ دوسرے سے: پتہ ہے یار، میرے ابو بہت بزدل ہیں۔ اکثر میرا سہارا لیتے ہیں۔
دوسرا بچہ: اچھا؟ وہ کیسے؟
پہلا بچہ: جب بھی سڑک پار کرنے لگتے ہیں تو ڈر کے مارے میرا ہاتھ پکڑ لیتے ہیں۔

نجیب احمد کی گمشدگی اور ایس آئی او کی کوششیں

اکتوبر ۲۰۱۶ میں نجیب احمد کی گمشدگی سانحے کے ایک سال بعد بھی سی بی آئی نے اپنی تفتیش میں کوئی خاطر خواہ پیش رفت نہیں کی۔ جے این یو کے گمشدہ طالب علم نجیب احمد کے کیس کو لیکر تقریباً تمام ہی طلباء تنظیمیں اور سوشل ایکٹیوسٹ سرگرم عمل ہیں اور نجیب احمد کی بازیابی کی مانگ کر رہے ہیں۔ اس معاملے میں سب سے زیادہ سرگرم عمل تنظیم اسٹوڈنٹس اسلامک آرگنائزیشن آف انڈیا ہے جو روز اول سے ہی صف اول میں ہے اور نجیب کی والدہ فاطمہ نفیس کے ساتھ قدم بہ قدم ہر محاذ پر کھڑی ہے۔ سی بی آئی کے اس غیر ذمہ دارانہ رویے پر ۱۳ اکتوبر کو دہلی سی بی آئی ہیڈ کوارٹرس پر ایک زبردست احتجاجی مظاہرہ کی ایس آئی او نے رہنمائی کی۔ اگلے روز دہلی ہائی کورٹ کے باہر احتجاج کے انعقاد پر مظاہرین کی گرفتاریاں بھی ہوئیں۔ اس سے قبل ۱۰ اکتوبر کو نجیب کے آبائی شہر بدایوں میں ایس آئی او نے پبلک میٹنگ کا بھی انعقاد کیا۔ اسی ماہ ملک کے مختلف تعلیمی اداروں جیسے جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی یونیورسٹی، مولانا آزاد اردو یونیورسٹی، الجامعہ الاسلامیہ، انگلش اینڈ فارین لینگویجیس یونیورسٹی وغیرہ میں احتجاجی مظاہرہ اور دیگر پروگرامس منعقد کئے گئے۔

اس سے قبل ایس آئی او نے ملک میں وسیع پیمانے پر پھیلے ہوئے اپنے کیڈر کو استعمال کرتے ہوئے بڑے پیمانے پر احتجاجی مظاہرے اور پریس میٹ منعقد کروائے ہیں۔ اس ضمن میں ایس آئی او کے افراد نے ایم پی، ایم ایل اے اور بینار یٹی کمیشن کے ذمہ داران سے ملاقات کرتے ہوئے ان کو میمورنڈم پیش کیا اور حکومت پر دباؤ ڈالنے کی کوشش کی۔ اس کے علاوہ ملک گیر سطح پر دستخطی مہم چلائی گئی جس میں 3.3 ملین دستخطوں کو جمع کیا گیا، اس دستخطی مہم میں 400 سے زائد ایم ایل اے، 70 ایم پی کے علاوہ کئی ساری ممتاز شخصیات نے حصہ لیا اور ان دستخطوں کو مرکزی بینار یٹی کمیشن کے حوالے کیا گیا۔ ایس آئی او نے مختلف مقامات پر دیگر طلبہ تنظیموں کے ساتھ راؤنڈ ٹیبل میٹنگ، ٹیبل ٹاک اور اسی طرز کے مختلف پروگرامز منعقد کیے جس میں ملک میں اقلیتوں پر ہو رہے اس طرح کے اور بھی مظالم پر گفتگو کی گئی اور ان کے حل کے لیے قراردادیں پیش کی گئیں۔ March to CBI headquarters, Chalo Badayu, March to High court اوران جیسے کئی سارے احتجاجی ریلیاں نکالی گئی جس میں ایس آئی او کے کئی افراد کو گرفتار کیا گیا۔

ایس آئی او آف انڈیا کی لیڈرس میٹ

ماہ اکتوبر کی 8 / 7 تاریخ کو ایس آئی او کے مرکزی دفتر میں شمالی ہندوستان کے زونل ذمہ داران کے لیے ایک دوروزہ تربیتی کیمپ لیڈرس میٹ ' کے تحت منعقد ہوا جس میں بطور خاص شمالی ہندوستان میں تنظیم کی افرادی قوت کو مزید تقویت پہنچانے نیز اس کے توسیع و استحکام کی طرف حلقہ کے ذمہ داران کو خصوصی توجہ دلائی گئی۔

شمالی ہندوستان میں تنظیمی کام کو بڑھانے اور اس کے توسیع و استحکام کے لئے مرکز نے نارتھ انڈیا کیمپین (شمالی ہند مہم برائے توسیع) کرنے کا فیصلہ کیا ہے جس کا آغاز یکم اکتوبر سے ہو چکا ہے، پانچ ماہ پر محیط یہ مہم فروری میں دہلی کے اندر منعقد ہونے والی ایک بڑی کانفرنس کے ذریعہ اختتام پذیر ہوگی۔ اس مہم کے دوران عوامی اجلاس، کارنر میٹ، پریس میٹ، کیمپس میٹ، کانفرنس اور سمپوزیم وغیرہ کے ذریعہ طلبہ و نوجوانوں تک پہنچنے کی کوشش کی جائے گی۔ نیز انہیں ان کے مقصد وجود سے واقف کرانے اور ان کے سامنے تنظیم کا تعارف پیش کرتے ہوئے انہیں تنظیم سے قریب لانے کی طرف توجہ دی جائے گی۔

تنظیم کے ذمہ داران نے یہ محسوس کیا ہے کہ ابتدائی و ثانوی درجات کے طلبہ پر خصوصی توجہ نہ دینا اور ان کا باقاعدہ تنظیمی ڈھانچے کا حصہ نہ بننا تنظیم کے مستقبل کے لئے نقصان دہ ہے لہذا تنظیم کی افرادی قوت کو مضبوط اور مستحکم کرنے کے لئے ایس آئی او نارتھ انڈیا کیمپین ' کے ذریعہ بطور خاص شمالی ہندوستان میں جونئر ایسوسی ایٹ سرکل پر خصوصی توجہ دے گی۔ اس دوروزہ تربیتی کیمپ میں ایس آئی او کے مرکزی ذمہ داران کے علاوہ، ماہر قرآنیات مولانا فاروق خاں صاحب، جناب رضوان رفیقی صاحب اور برادر مسیح الزماں انصاری وغیرہ نے بھی خطاب کیا۔

مشہور صحافی گوری لنکیش کے قتل اور اختلاف کی آوازوں کے دبانے کے دیگر واقعات کے حوالے سے جنتر منتر دہلی پر منعقدہ ''مارچ فار ڈیموکریسی'' میں ایس آئی او کی نمائندگی۔

ایس آئی او آف انڈیا کے جنرل سکریٹری برادر خلیق احمد نے مسلم پرسنل لا بورڈ کے صدر مولانا رابع حسنی ندوی سے ملاقات کی اور مختلف سماجی وسیاسی معاملات پر گفتگو کی۔

۱۴ اور ۱۵ اکتوبر کو ایس آئی او ہیڈ کوارٹر پر منعقدہ دوروزہ ڈیزائننگ ورکشاپ بعنوان Fostering Artistry میں ہندوستان کے مختلف حصوں سے ایس آئی او کے کارکنان نے شرکت کی۔

ادبی اشاعت
جلد آرہا ہے۔۔